خالد فتح محمد کے ناولوں میں انسانی استحصال کا تجزیاتی مطالعہ

(بحوالہ: "خلیج"، "زینہ")

مقالہ برائے ایم فل اُردو

مقالہ نگار:

سارہ نواز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۱ء

خالد فتح محمد کے ناولوں میں انسانی استحصال کا تجزیاتی مطالعہ

(بحوالہ: "خلیج"، "زینہ")

مقالہ نگار:

سارہ نواز

یہ مقالہ

ایم فل اُردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگو یجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگو یجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: خالد فتح محمد کے ناولوں میں انسانی استحصال کا تجزیاتی مطالعہ (بحوالہ "خلیج"، "زینہ")

پیش کار: سارہ نواز، رجسٹریشن نمبر 1459/M/U/S18

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اُردو زبان وادب

ڈاکٹر ارشاد بیگم

____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر صوفیہ لودھی

____

ڈین فیکلٹی آف لینگو یجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان

____

پرو ریکٹر اکیڈمکس

تاریخ ______

اقرار نامہ

میں سارہ نواز حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم فل سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر ارشاد بیگم کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

سارہ نواز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جون ۲۰۲۱ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر

ABSTRACT

Title: "An Analytical Study of Human Exploitation in Khalid Fateh Muhammad's Novels with Reference To *"Khaleej",* and *"Zeenah".*

The salient points of this research thesis are to analysis "human exploitation" as reflected in fictional writing of Major (R) Khalid Fatah Muhammad. The research mainly focused on two selected novels of Khalid Fatah Muhammad, which includes *"Khalij"* and *Zeenah".*

Novelist is well renowned contemporary novelist. His fictional work is not limited to single topic, he covers variety of social subjects in his novels. One of his favourite subjects is "Human Exploitation". He presents women exploitation, political and human exploitation in these both novels. He also presents minority issues with reference to Christianity and Hindus living in Pakistan.

In his novels, he does not limit himself to just indicate the burning issues but he makes an endeavour to give resolve of these issues.He fearlessly writes against double standards of our social system, but he never uses rhetoric in his writing. He describes an issue with his characters and incidents in his novels. This quality makes him prominent in contemporary writers. He has a high degree of political and social wisdom, which gives him an opportunity to write comprehensively on such topics.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں شکر ادا کرتی ہوں رب کریم کا جس نے میرے لیے آسانیاں پیدا کیں اور تحقیق کے ہر مرحلے کو آسان بنایا۔ شکر گزار ہوں تمام اساتذہ کرام کی جنہوں نے اس کام میں مجھے راہنمائی فراہم کی۔ خاص طور پر اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر ارشاد بیگم کی جن کی کوششوں سے میرا مقالہ تکمیل کو پہنچا۔ میں صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتی ہوں ڈاکٹر حمیرا اشفاق، خالد فتح محمد اور خالد اقبال یاسر کا جنہوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔

میں اپنے والدین، بھائی، بہنوں اور شریکِ حیات اور دیگر احباب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا، میری ہمت بڑھائی نیز مقالہ لکھنے کا وقت اور پُر سکون ماحول فراہم کیا۔

سارہ نواز

سکالر ایم۔ فِل اُردو

باب اول:

موضوع تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

ا۔ موضوع کا تعارف:

خالد فتح محمد کا نام اردو ناول کے حوالے سے معروف اور ممتاز ناول لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ناول لکھتے ہوئے وہ ایک موضوع پر نہیں ٹھہرتے بلکہ اس ضمن میں مصنف نے ہر طرح کے موضوعات قلمبند کیے ہیں۔ان موضوعات میں سے ایک موضوع معاشرے میں ہونے والا انسانی استحصال ہے جسے مصنف نے زیادہ سے زیادہ موضوع بحث بنایا ہے۔میرے ایم۔فل مقالے کا مجوزہ موضوع "خالد فتح محمد کے ناولوں میں انسانی استحصال کا تجزیاتی مطالعہ "ہے۔اس حوالے سے ان کے دو ناولوں "خلیج"،"زینہ "کو دیکھا گیا ہے۔خالد فتح محمد ایک سیاسی و سماجی شعور رکھنے والے انسان ہیں یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں ہونے والے انسانی استحصال کو کمال خوبی سے اپنے ناولوں بیان کرتے ہیں۔

۲۔ بیان مسئلہ:

دورِ حاضر کا انسان مختلف قسم کی سیاسی و سماجی صورتحال سے دوچار ہے۔اس معاشرتی صورتحال کو خالد فتح محمد نے اپنے ناولوں میں کمال خوبی سے بیان کیا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ جائزہ لیا جائے کہ مصنف نے اس معاشرتی صورتحال کو واقعات اور کرداروں کے ذریعے کس طرح بیان کیا ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق:

مجوزہ تحقیقی مقالے کے درج ذیل مقاصد ہیں:

ا۔ منتخب ناولوں کے کرداروں میں انسانی استحصال کی مختلف صورتوں کو دیکھنا۔

ب۔ سیاسی و سماجی استحصال کو خالد فتح محمد کے ناولوں کے تناظر میں سمجھنا۔

ج۔ اقلیتوں کے استحصال کو ناولوں کے واقعات کے ذریعے اجاگر کرنا

۴۔ تحقیقی سوالات:

الف۔ ناولوں میں انسانی استحصال کی کیا کیا صورتیں پیش کی گئی ہیں؟

ب۔ سیاسی حوالے سے انسانی استحصال کو کیسے دکھایا گیا ہے؟

ج۔ اقلیتوں کے استحصال سے کسی بھی معاشرے پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

استحصال ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی ایک شخص، ادارے، معاشرے یا طبقے کی طرف سے اپنے سے کمزور کا حق مارا جاتا ہے، اس کی حق تلفی کی جاتی ہے، جب استحصال کی صورت سنگین ہو جائے تو سماج نا انصافی اور کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ معاشی استحصال، سیاسی استحصال، مذہبی استحصال، نسلی استحصال، طبقاتی استحصال، جنسی استحصال، نفسیاتی استحصال، جسمانی استحصال، انسانی استحصال کی مختلف صورتیں ہیں۔ استحصال کی ان تمام صورتوں میں ایک مشترک قدر یہ ہے کہ اس سارے عمل کے دوران ایک شخص کا حق مارا جاتا ہے اور دوسرا اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

یہی وہ عمل ہے جو سماج میں نابرابری کی بنیاد بنتا ہے اور معاشرہ اونچ نیچ کا شکار ہو جاتا ہے۔ تحقیق میں استحصال اور استحصالی عوامل کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے Germen NGO Network against Human Trafficking >> Forms of Trafficking in Human Beings کے ریسرچ پیپر Exploitation سے استفادہ کیا گیا۔

تحقیقی موضوع خالد فتح محمد کے منتخب ناولوں میں دکھائے گئے انسانی استحصال اور اس کی مختلف صورتوں کا تجزیہ کرنے کے لیے مصنف کے دو ناول "خلیج"، اور "زینہ "بنیادی ماخذ کے طور پر پیش نظر رہے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

زیرِ نظر مقالے میں خالد فتح محمد کے ناولوں "خلیج"، "زینہ" پر انحصار کیا گیا ہے۔ ان بنیادی آخذ کے علاوہ ثانوی آخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بنیادی آخذ تک رسائی کے بعد خالد فتح محمد کے حالات زندگی اور شخصیت سے آگاہی کے لیے خالد فتح محمد سے گفتگو بھی شامل تحقیق رہی۔ انٹرویوز، کانفرنسیں، سیمینار، تحقیقی رسائل و جرائد کے ساتھ ساتھ انسانی استحصال کے حوالے سے تحقیقی و تنقیدی کتب کا مطالعہ بھی شامل تحقیق ہے۔ جن میں سے چند کی فہرست ثانوی کتب میں دی گئی ہے۔ ان کتب تک رسائی کے لیے سرکاری، جامعاتی اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

مجوزہ موضوع "خالد فتح محمد کے ناولوں میں انسانی استحصال کا تجزیاتی مطالعہ "بحوالہ " خلیج"، "زینہ " پر ایم۔اے، ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی میں کسی قسم کا تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ہوا۔

۸۔ تحدید:

خالد فتح محمد نے بطور ناول نگار، افسانہ نگار، تنقید نگار کے ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی لیکن زیر نظر میرے ایم۔فل کے مقالے کا مقصد صرف مصنف کے دو منتخب ناولوں میں دکھائے گئے انسانی استحصال کے تجزیاتی مطالعے تک محدود ہے۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

پس منظری مطالعہ کے طور پر انسانی استحصال کے بنیادی مباحث کو دیکھا گیا ہے ا۔اس حوالے سے انسانی استحصال پر لکھی گئی کتب، کالم، مضامین کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

خالد فتح محمد اُردو ادب میں ناول نگاری کے میدان میں سماجی شعور رکھنے والے اہم ناول نگار ہیں۔اگر ان کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کس طرح مصنف نے اپنے منفرد اسلوب کی بدولت انسانی استحصال کو ادب کا حصہ بنایا ہے۔اپنے ناولوں میں وہ جس طرح انسانی استحصال کو واقعات اور کرداروں کے ذریعے بیان کرتے ہیں اس سے ان کے سماجی شعور کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ب۔استحصال (معنی و مفہوم):

استحصال کا لفظ ہم روزمرہ زندگی میں سنتے ہیں اور استعمال بھی کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ استحصال ہے کیا، اس کے جواب کے لیے لفظ "استحصال" کے لفظی معنی اور اس کی تعریف کو دیکھیں تو استحصال ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی ایک شخص، ادارے، معاشرے یا طبقے کی طرف سے اپنے سے کمزور کا حق مارا جاتا ہے، اس کی حق تلفی کی جاتی ہے، جب استحصال کی صورت سنگین ہو جائے تو سماج ناانصافی اور کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔استحصال کے عمل کو سمجھنے کے لیے اس کے معنی اور تعریف دیکھیں گے، مختلف ماہرین نے اس کو کس معنی میں استعمال کیا ہے۔

i۔ لغوی معنی:

آزاد دائرہ المعارف میں استحصال کے معنی یہ درج ہیں۔

"استحصال" کا لفظی معنی طلب، ماحصل ہے، یعنی جو حاصل ہو اسے لے لینا یا اپنا لینا۔ ناجائز استفادہ، ناجائز فائدہ، غلط فائدہ، ناجائز استعمال، ناجائز منافع، انگریزی میں استحصال کے لیے Exploitation کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔"[۱]

اُردو آکسفورڈ ڈکشنری میں استحصال کے معنی درج ذیل ہیں:۔

"استحصال عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مادہ ح، ص، ل ہے۔ جس کے معنی ہیں زبردستی حاصل کرنا اور چھین لینا۔"[۲]

فیروز اللغات میں استحصال کے معنی درج ہیں،

"طلبِ حصول، حاصل کرنا۔ استحصال کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

استحصال بالجبر: "زبردستی حاصل کرنا۔ ڈرادھمکا کر کوئی چیز لینا۔

استحصال ناجائز: خلافِ قانون طریق پر حاصل کرنا۔"[۳]

علمی اُردو لغت کے مطابق:

"استحصال عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں حاصل کرنا، حاصل کرنے کی خواہش رکھنا، چھین لینا، چھین لینے کا عمل یا کیفیت۔

استحصال بالجبر: زبردستی چھین لینا، زبردستی حاصل کرنا، جبراً چھین لینے کا عمل۔"[۴]

ii۔ تعریف :

سٹینڈ فورڈ انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی میں استحصال کی تعریف کچھ یوں ہے:

"To exploit someone is to take unfair advantage of them. It is to use another Person's vulnerability for one's own benefit. The action or fact of treating someone unfairly in order to benefit from their work. The fact of making use of a situation to gain unfair advantage for someone. Exploitation is defined as the act of using resources or the act of treating people unfairly in order to benefit from their effort or labour."[5]

کے او کے جرمن این جی او کے ریسرچ پیپر میں استحصال کی تعریف کی گئی ہے:

Trafficking in human being and exploitation are multi-layered phenomena that can take many different forms…….their common characteristic is the element of constraint, deceit, threat etc. (6)

استحصال کے ان معانی اور تعریفات کو دیکھا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ استحصال ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں دوسروں کی چیز پر ناجائز طریقے سے قبضہ کیا جائے۔ دوسروں کا حق غلط طریقے سے یا جبراً چھین لیا جائے۔ دوسروں کے مال و ملکیت سے ناجائز فائدہ اٹھانا بھی استحصال کے زمرے میں آتا ہے۔

ج۔ انسانی استحصال کی مختلف صورتیں:

استحصال کے معنی و مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ استحصال کیا ہے اور یہ کس طرح سے معاشرے میں اور کن صورتوں میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ کارل مارکس وہ واحد شخص تھا جس نے تاریخ میں پہلی بار اس معاملے کا سائنسی تجزیہ کیا اور اس عمل کی بنیاد کو سمجھا۔ ماضی میں تقدیر کا لکھا سمجھ کر جس طرح سے مزدور طبقے کا استحصال کیا جاتا تھا۔ کارل مارکس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور مزدور، محنت کش کو اس کے دشمن سے آگاہ کیا۔ اس نے کہا کہ نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ نظام ہی استحصال کی جڑ ہے۔ مارکس کا کہنا تھا کہ سرمایہ داری نظام اپنے اندر استحصال کی نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔

سرمایہ داری نظام میں سرمایہ دار مزدور کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں دیتا جو استحصال کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ مزدور اپنے ہاتھوں اور محنت سے جو دنیا تخلیق کرتے ہیں وہی ان سے بیگانہ کر جاتی ہے۔ ان کی محنت سے ہسپتال تعمیر ہوتے ہیں لیکن علاج کے وقت اسی ہسپتال میں ان سے خطیر رقم وصول کی جاتی ہے۔ ان کی محنت سے بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں لیکن یہ خود ساری زندگی اپنے لیے گھر نہیں بنا پاتے۔ ہماری دولت سے سرمایہ دار اپنی اولادوں کی شادیوں پر کروڑوں خرچ کرتے ہیں لیکن ہمارے پاس سادگی سے بیاہنے کے لیے چند ہزار نہیں ہوتے۔

یہی استحصال زدہ انسان زندہ رہنا تو دور مرنے سے بھی ڈرتا ہے کہ کہیں مرتے وقت ساری زندگی کی سفید پوشی کا پردہ فاش نہ ہو جائے، کفن دفن کے لیے گھر والوں کو دوسروں کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔

یہی وہ تمام حالات ہیں جس کی وجہ سے سرمایہ داری نظام کو استحصال کی بنیاد کہا گیا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر نعیم قاسم اپنے مضمون "استحصال کی جڑ" میں لکھتے ہیں:

"سرمایہ دارانہ معیشت میں ہر طرح کی معاشی سرگرمی کی بنیاد استحصال اور محور منافع اور ذاتی مفاد ہوتا ہے۔"(۷)

اسکے علاوہ بااثر افراد چاہے گھر میں ہوں یا معاشرے میں، مرد ہو یا عورت، اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے اپنے سے کم حیثیت لوگوں کے ساتھ ہتک آمیز رویہ رکھتے ہیں اور اپنے مفاد کے لیے ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔جو کہ ایک طرح استحصال ہے۔عورتیں اور بچے معاشرے کے ایسے افراد ہیں جو معاشی طور پر غیر مستحکم ہوتے ہیں۔اس لیے ان کی اکثریت بھی استحصال کا شکار رہتی ہے۔

یہ وہ تمام وجوہات یا اسباب ہیں جن کی وجہ سے بین الاقوامی سطح اور قومی سطح پر استحصال کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ آج کے دور میں جہاں بہت سارے مسائل انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ان میں ایک مسئلہ استحصال بھی ہے۔انسانی استحصال برائی کی حدود سے نکل کر ایک پیچیدہ مسئلے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔معاشرے میں ہر جگہ استحصال کی کوئی نہ کوئی صورت دکھائی دیتی ہے۔اب صورتحال یہ ہے کہ یہ بات اتنی عام معلوم ہونے لگی ہے کہ اس قسم کے واقعات کو اب لوگ توجہ نہیں دیتے اور معمول کی کیفیت سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

i۔ مذہبی استحصال:

پوری دنیا میں استحصال اور امتیاز کی جتنی بھی صورتیں موجود ہیں ان میں مذہب اور عقیدے کے نام پر ہونے والا استحصال ایسا ہے جس کا ادراک استحصال کرنے والوں کو خود نہیں ہوتا۔انسان جہاں بہت سے عوامل اور مسائل سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہے انہی عوامل میں سے ایک مذہب بھی ہے۔یہ وہ عوامل ہیں جن کا سہارا لے کر انسان نے کبھی تو صبر و برداشت کے طویل سفر کیے اور کبھی تباہی کا شکار ہوا۔مذہب اور انسان کا تعلق کافی پرانا اور گہرا ہے، یہی وجہ ہے کہ مذہب کے ساتھ اس کی وابستگی اتنی ہے کہ مذہب کو کسی انسان کی جان سے بھی زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔مذہب انسان کو اخلاق، قربانی، ایثار اور محبت کا درس دیتا ہے اس کے باوجود آج کا معاشرہ نفسا نفسی اور کشمکش کا شکار ہے، کسی کی جان محفوظ نہیں، اگر مذہب انسان کو قربانی، محبت کا درس دیتا ہے تو سوال یہ ہے کیوں آج کسی کی جان محفوظ نہیں کیوں محبت، ایثار کی جگہ خود غرضی نے لی ہے۔کیوں کہ قربانی کا مطلب کسی کا امتحان لینا اور خود کو اس سے آزاد سمجھنا ہے۔یہ وہ سوال ہیں

جو اپنا ایک وجود رکھتے ہیں لیکن جو طبقہ خود کو مذہب کا ٹھیکیدار سمجھتا ہے وہ ان تمام سوالوں سے انکار کرتا ہے اور جو کوئی سوال کرے انہیں مذہب کا دشمن سمجھ کر قتل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور یہی مذہبی استحصال ہے۔ بجائے اس کے کہ ان سوالوں کے جوابات دیئے جائیں یہ مذہبی ٹھیکیدار سوال کرنے والے کو جاہل گنوار اور گناہ گار قرار دے کر اس کا منہ بند کر دیتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ صرف ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے لوگوں کا استحصال کریں۔ بلکہ اکثر تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک ہی مذہب کے لوگ ایک دوسرے کا استحصال کرتے ہیں۔ ماضی اس بات کا گواہ ہے کہ مذہب بھی معاشرے کے بالادست طبقوں کا ہتھیار رہا ہے جن کا مقصد اقتدار چند لوگوں کی مٹھی میں رکھ کر باقی سب پر حکومت کرنا تھا۔ اظہر سلیم لکھتے ہیں:

"انہیں اچھائی، برائی، نیکی، بدی، جنت، اور دوزخ کے جال میں پھنسا کر انہیں تقدیر کے دھاگے میں قید کرنا تھا اور خود ہر طرح سے آزاد رہنا تھا"۔[۸]

بھارت میں اس وقت مسلمانوں کے علاوہ عیسائی، سکھ، بدھ مت جیسی مذہبی اقلیتیں رہتی ہیں۔ یہ سب اقلیتیں اپنے جان و مال کے تحفظ اور مذہبی آزادی کے لیے ہندو حکومت کے رحم و کرم پر ہیں۔ تاریخ کو دیکھا جائے تو تقسیم ہند کے بعد بھارتی حکومت نے اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کہا تھا کہ بھارت ایک سیکولر ریاست بنے گی جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور دیگر مذہب کے لوگوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے، لیکن ماضی سے تاحال بھارت میں عملاً ایسا نہیں ہوا۔ اقلیتوں کو ہمیشہ انتہا پسند ہندوؤں کے ظلم و جبر اور امتیازی سلوک کا سامنا رہا ہے۔ اور انہیں اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ہندو بالادستی کو قبول کریں۔ معروف بھارتی مصنفہ ارون دتی رائے نے ۲۳ دسمبر ۲۰۱۵ء کو بمبئی میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"بھارت میں اقلیتیں خوف کے ماحول میں رہ رہی ہیں اور تشدد پرستی کے بڑھتے ہوئے جارحانہ رویوں کو "عدم رواداری" کے جھوٹے سے نام میں موسوم نہیں کیا جاسکتا"۔[۹]

ہندو قومیت پسند گروہوں کی وجہ سے مذہبی اقلیتوں پر حلقہ زندگی تنگ ہوتا جارہا ہے۔ ان کو تشدد، آزادی رائے سے محرومی اور اختلافی پن جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق آگرہ میں ایک عوامی اجتماع میں سینکڑوں مسلمانوں کو جبری طور پر ہندوازم میں تبدیل کیا گیا۔ آئین میں درج اقلیتوں کے مذہبی حقوق ہمیشہ سے نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ بھارت میں بسنے والی اقلیتوں کی عبادت گاہیں بھی محفوظ

نہیں۔ حال ہی میں بابری مسجد گرا کر مندر کی تعمیر کی منظوری مذہبی تعصب کی ایک مثال ہے۔ اس سے مسلمانوں کے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچی کیونکہ بابری مسجد ایک تاریخی عبادت گاہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جس میں بھارت حکومت کی طرف سے اقلیتوں کے حقوق پورے نہیں کیے جاتے۔

بھارت کے علاوہ پاکستان میں بھی کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں پر اقلیتوں کا مذہبی استحصال کیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے استحصال کے حوالے سے رشاد بخاری نے اپنے مضمون "مذہبی استحصال کی عام مثالیں" میں بہت سے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن میں اقلیتی مسیحی برادری کو مسائل یا پریشانی کا سامنا رہا ہے۔ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ ایک مسیحی شخص کو باہر سے پینا فلیکس کا ٹکڑا ملا وہ اسے گھر لے آیا اور اسے دستر خوان کے طور پر استعمال کرنے لگا۔ محلے کی ایک مسلمان عورت نے دیکھا کہ پینا فلیکس پر عربی کے الفاظ درج ہیں اس نے محلے میں شور مچا دیا کہ فلاں مسیحی شخص نے ہمارے مذہب کی بے حرمتی کی ہے جس سے پورا محلہ ان کی جان کے درپے ہو گیا اور اس شخص کو وہ علاقہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ ایسی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح آسانی سے لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اقلیتوں کے لیے مسائل کھڑے کیے جاتے ہیں۔ لاہور کے بادامی باغ میں عیسائیوں کی پوری آبادی کو جلا دیا گیا۔ تھر اور اندرونِ سندھ میں بھی ایسے واقعات سامنے آئے ہیں جس میں ہندوؤں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا گیا اور ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کیا گیا۔

ii۔ سیاسی استحصال:

استحصال کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم سیاسی استحصال بھی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ استحصال کی یہ قسم کس طرح سے معاشرے میں رونما ہوتی ہے۔ کسی بھی ملک کی سیاست یا سیاسی قیادت جب ایک عام آدمی کو انسانی بنیادی حقوق فراہم کرنے میں ناکام رہے اور سالہا سال ہونے والے الیکشن میں عوام کا دل صرف جھوٹے وعدوں سے بہلایا جائے تو یہ عوام یا ایک آدمی کا سیاسی استحصال ہے۔ اس کے علاوہ موروثی و روایتی سیاسی نظام کے ذریعے بھی عوام کا سیاسی استحصال کیا جاتا ہے۔ عوام کی حیثیت حکمرانوں کی نظر میں صرف ایک ووٹرز سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اسی لیے عوام بھی کچھ وقت گزرنے کے بعد ان حکمرانوں سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑی کرب ناک حقیقت ہے کہ موروثی و روایتی سیاست نے اس ملک کی عوام کو ایسے مہلک مسائل کے سپرد کر دیا جو ان کی پشت پر مسلسل کوڑے کی شکل میں برس رہے ہیں۔ موروثی سیاست سے سیاسی نظام مفلوج ہو جاتا

ہے۔ جب اس سیاست میں دولت کا عنصر غالب آجائے تو جاگیر دار اور سرمایہ دار طبقہ سر اٹھانے لگتا ہے اور ان دونوں طبقوں کے لیے سیاست کاروبار کی طرح ہوتی ہے۔ راؤ غلام مصطفٰی لکھتے ہیں:

"اقوام متحدہ کے چارٹر آئین پاکستان میں یہ آرٹیکل موجود ہے کہ روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور صحت کی سہولت عام فرد کو بہم پہنچانا ریاست کی ذمہ داری ہے لیکن بنیادی انسانی حقوق کا یہ آرٹیکل آج تک معطل ہے۔"(١٠)

عوام کو فیصلہ سازی سے محروم رکھا جاتا ہے اور نہ ہی عوام کی سوچ اور خواہشات کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔ حکومتی ایوانوں میں بیٹھے طبقے ہمیشہ مفاد عامہ کے برعکس پالیسیاں مرتب کرتے ہیں، بجٹ سامنے آئے تو اس میں بھی غریب عوام کی بجائے اشرافیہ کی مراعات اور سہولیات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک عام آدمی مزید مسائل کے گرداب میں پھنس رہا ہے۔ پاکستان کا سیاسی نظام موروثیت کا شکار ہے، چند سرمایہ دار اور جاگیر دار خاندان ملکی سیاست پر قابض ہیں جو عوام کو بنیادی حقوق سے محروم رکھ کر ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ نتیجتاً سیاستدان ایک طرف اپنے مقاصد پورے کر رہے ہیں اور عوام غریب سے غریب تر ہوتی جا رہی ہے جبکہ سیاستدان اور ان کے زیرِ سایہ اشرافیہ امیر سے امیر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ رئیس انصاری لکھتے ہیں:

"ایسا لگتا ہے کہ سیاست دان شہنشاہ وقت اور عوام بچاری ان کی رعایا ہے"۔(١١)

جس طرح مکار لوگ بوقت ضرورت گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں اسی طرح سیاستدان بھی انتخابات کے نزدیک جلسوں میں عوام کو اپنی چکنی چپڑی تقریروں سے مزید پانچ سالوں کے لیے بے وقوف بنا لیتے ہیں اور یوں پھر سے غریب عوام کا استحصال شروع ہو جاتا ہے۔ سیاستدان عوام سے جھوٹے وعدوں کے ذریعے ووٹ تو لے لیتے ہیں لیکن ان میں سیاسی آگاہی بیدار کرنے کی قطعی کوشش نہیں کرتے اگر سیاستدان عوام کو سیاسی شعور دیں تو کل کو یہی عوام ان کے مدِمقابل آکر اپنے حق کے لیے کھڑی ہو سکتی ہے۔ اور ملک سے موروثی سیاست ختم ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حکمران عام عوام کو ایسی آگاہی سے دور رکھنے کی حق الامکان کوشش کرتے ہیں۔ تعلیم کے بہتر مواقع فراہم نہیں کرتے جب کہ ان کے اپنے بچے باہر ممالک جا کر پڑھتے ہیں اور پھر واپس آکر اسی غریب عوام پر حکمرانی کرنے لگتے ہیں۔

سیاستدان ہو، صنعت کار ہو یا زمیندار اسے ہمیشہ یہ ڈر ہوتا ہے کہ اگر غریب عوام کو پیٹ بھر کر روٹی مل گئی اور ان کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کر دیا تو ان کی پوجا کرنے والے ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں

گے۔ اس لیے یہ عوام کو تعلیم سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تا کہ نسل در نسل حکمرانی کریں اور عوام کو کچلتے رہیں اور قومی خزانے کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کریں۔ عوام کی بہتری اور فلاح کے لیے کوئی قانون سازی نہیں کی جاتی جبکہ بات کسی سیاستدان کی آجائے تو گھنٹوں میں نیا قانون بنا کر منظور کروالیا جاتا ہے۔ رئیس انصاری لکھتے ہیں:

"عوام کی فلاح اور بہبود کے لیے قانون سازی تو دور کی بات ایسی کسی قرار داد کی بازگشت بھی ایوان میں نہیں سنی جائے اور سیاست دان کو بچانے کے لیے ایک دن میں نیا قانون بنا کر منظور کروالیا جائے"۔ (۱۲)

عوام کا حق مارنے اور تعلیم سے دور رکھنے کے ساتھ ساتھ عوام کا ایک اور طرح سے بھی استحصال ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایک عام آدمی کو اس بات تک علم نہیں ہوتا کہ جو کونسلر، صوبائی نمائندہ یا رکن قومی اسمبلی اس کی ووٹ سے منتخب ہوا ہے اس کی ذمہ داریوں اور اختیارات میں کیا فرق ہے؟ عوام کی اکثریت اپنے علاقے کے نمائندے تک کو نہیں پہچانتی، جس میں عوام کا کوئی قصور نہیں کیونکہ منتخب ہونے کے بعد یہ نمائندے اپنے علاقے سے اکثر غائب رہتے ہیں۔

المختصر یہ کہ صورتحال کو بدلنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب کسی ملک کی اندرونی صورتحال اس قدر خراب ہو تو بین الاقوامی سطح پر بھی اس ملک کی عزت نہیں ہوتی۔ اس لیے اب عوام کو خود حتمی قدم اٹھانا ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد اپنے ملکی حالات اور بالخصوص سیاسی حالات سے مکمل آگاہی حاصل کرے۔ اسے اپنے سیاسی حقوق کا اندازہ ہو تا کہ وہ اپنے ووٹ سے ایسے نمائندوں کا انتخاب کرے جو اس کی بہتری کے لیے کام کریں۔

کیونکہ عوام کا سیاسی صورتحال سے آگاہ نہ ہونے کے نتائج سنگین ہوتے ہیں اور اسی لاعلمی کی بدولت ایسے نمائندے عوام پر مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو ووٹ کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے انسانیت کی پامالی اور استحصال نہایت آسان ہوتا ہے۔ ان نمائندوں کے ہاں انسانی حقوق کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ عوام کو اپنے حقوق سے آگاہی ہو اور ان میں قوت فیصلہ موجود ہو تا کہ وہ ووٹ کا بہتر استعمال کریں۔ ورنہ جب تک جاگیر داری سیاست ان کے سروں پر رہی تو محنت کش عوام کا استحصال ہوتا رہے گا۔

iii۔ جنسی استحصال:

ویکیپیڈیا پر جنسی استحصال کی تعریف کی گئی ہے کہ:

"جنسی غلامی یا جنسی استحصال قدیم دور سے چلا آرہا رواج ہے، جس کے تحت ایک یا ایک سے زیادہ اشخاص کو یہ اختیار تھا کہ زبردستی سے یا باہمی رضامندی سے کسی شخص سے جنسی افعال کروائیں۔"(۱۳)

جنسی زیادتی یا استحصال کا شکار سب سے زیادہ بچے اور عورتیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بالغ اور نابالغ مرد بھی جنسی استحصال کا نشانہ بنتے ہیں تاہم اکثریت بچیوں اور خواتین کی ہے۔ جنسی استحصال کرنے والا فرد یا گروہ مختلف طریقوں سے جنسی استحصال کرتے ہیں۔ بعض اوقات اغوا کر کے جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جنسی کاموں کے لیے فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یا جبری طور پر غلاموں کی سی حالت میں جسم فروشی کرائی جاتی ہے۔ اس طرح کا جنسی استحصال زیادہ تر امریکا، یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا میں ہوتا ہے، ان متاثرین میں سے اکثریت کو جبری مشقت پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

ایک عالمی ادارے کی رپورٹ کے مطابق بین الاقوامی سطح پر ہر سال انسانوں کی تجارت کی جاتی ہے جن میں تقریباً ۲۳ فیصد نابالغ بچیاں ہوتی ہیں جن کو جسم فروشی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ الغرض کہ ہر معاشرے میں عورتیں اور بچے ہمیشہ سے جنسی زیادتی کا شکار رہے ہیں۔ آگے چل کر عورتیں اور بچوں کے جنسی استحصال پر فرداً فرداً اور تفصیلی بحث کریں گے۔

ہر مہذب معاشرہ انسانوں کی وجہ سے ہی اپنا وجود قائم رکھ پاتا ہے۔ بچے کسی بھی معاشرے کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت معاشرے کا فرض ہے، اس کی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ اور اس معاملے میں لاپرواہی سنگین نتائج کا باعث بنتی ہے۔ آزاد دائرہ المعارف ویکیپیڈیا کے مطابق:

"بچوں کا جنسی استحصال کسی بچے کے ساتھ بالغ یا نو عمر فرد کی جنسی محرک کے لیے زیادتی کی شکل ہے"۔(۱۴)

بچپن عمر کا خوبصورت اور بے فکری کا دور ہوتا ہے۔ معصومیت بچوں کا سرمایہ ہوتی ہے لیکن بچپن میں جنسی استحصال کر کے ان سے بے فکری اور معصومیت چھین لی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی بچہ جنسی زیادتی کا شکار ہوتا ہے تو وہ واقعہ بچے کی آئندہ پوری زندگی اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔

پاکستان جس کی تقریباً چالیس فیصد آبادی پندرہ سال سے کم عمر افراد کی ہے یہی ہمارا مستقبل ہیں اور پریشان کن صورتحال یہ ہے کہ یہی بچے جنسی استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔ بچوں کے اس مسئلے کو حل کرنے کی بجائے والدین اور معاشرہ مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ مسئلہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ نادیہ عنبر لودھی "بچوں کا جنسی استحصال" میں لکھتی ہیں:

"اس قسم کے ظلم سے بچوں میں جو نفسیاتی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ وہ عمر بھر پیچھا کرتے ہیں بچے عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی صلاحتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ ڈر، خوف، عدم اعتماد اور تنہائی جیسی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔"(۱۵)

یک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر دن تقریباً ۹ بچے جنسی استحصال کا نشانہ بنتے ہیں اور بچوں سے زیادتی کرنے والے زیادہ تر ان کے اپنے واقفیت کے لوگ شامل ہیں۔ اپنا یہ جرم چھپانے کے لیے بچوں کو موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔ اگر مجرم پکڑا بھی جائے تو اسے کڑی سزا نہیں دی جاتی، جس سے ان واقعات میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہو رہا ہے۔

بچوں کے جنسی استحصال کے واقعات میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں ہمارے میڈیا نے بھی نمایاں کیا لیکن کسی بھی مجرم کو کیفر کردار تک نہیں پہنچایا گیا۔ رداء، رافعہ، اسماء، زینب اور ملائکہ جیسی معصوم بچیاں اور ان کے والدین انصاف کے انتظار میں رہے لیکن قانون ساز ادارے معمولی کارروائی کے بعد خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو ہمارے معاشرے کا بدنما داغ ہیں، سیاست اور اختلافات اپنی جگہ لیکن ان واقعات پر قابو پانے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ مجرم کو شرعی سزائیں اور انصاف کی فوری فراہمی ان گھناؤنے واقعات کو روک سکتی ہے۔ والدین، اساتذہ اور معاشرے کے برسر اقتدار لوگ مل کر اپنی ذمہ داری کو سمجھیں، والدین بچوں پر نظر رکھیں اور بچوں کو ایسا اعتماد دیں کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی والدین کو بتا سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مجرم کو کڑی اور بروقت سزا دے کر بھی ان واقعات کو روکا جا سکتا ہے۔

بچوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی جنسی استحصال کا نشانہ بنتی ہیں۔ ہر معاشرے اور طبقے میں عورت جنسی عدم تحفظ کا شکار ہے۔ مغرب میں جہاں عورت اپنے ساتھ ہونے والے استحصال کے خلاف آواز اٹھا سکتی ہے اس کے برعکس پاکستان میں اپنی بدنامی کے ڈر سے کسی کے سامنے اس بات کا ذکر کرنے کا تصور بھی نہیں کرتی۔ جنسی استحصال کے واقعات صرف پسماندہ علاقوں میں ہی نہیں رونما ہوتے بلکہ پاکستان کے بڑے

شہروں، پڑھے لکھے لوگوں ، دفاتر میں، مالکان اور افسران کے خواتین کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے واقعات عام ہیں۔ نوکری سے نکالے جانے کے ڈر سے یا بدنامی کا خوف انہیں زبان کھولنے سے روکتا ہے۔

ان واقعات کو کنٹرول نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورتیں خودکشی کر لیتی ہیں یا ساری زندگی استحصال کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔ کیونکہ اس معاشرے کا نظام ایسا نہیں کہ عورت اپنے ساتھ ہونے والے ظلم پر آواز اٹھائے یا تن تنہا اس ظلم کی رپورٹ درج کرائے۔ کیونکہ وہ اکیلی انصاف کے لیے تھانے میں کھڑی نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اکثر واقعات درج ہی نہیں ہوتے اور اگر درج ہو بھی جائیں تو جس انداز سے تحقیقات ہوتی ہیں وہ اس زیادتی و ظلم سے بھی زیادہ تکلیف دہ عمل ہے۔ رافعہ اعوان لکھتی ہیں:

"ایکسپریس ٹربیون کی ہی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کی ۹۳ فیصد خواتین جنسی تشدد کا نشانہ بنتی ہیں جبکہ صوبہ سندھ اور پنجاب میں صرف ۱۰ فیصد کیسز رپورٹ ہوتے ہیں"۔[۱۶]

سیکولر ازم کا ڈھنڈورا پیٹنے والا ملک بھارت خواتین کے لیے دنیا میں سب سے خطرناک قرار دیا گیا ہے۔ جہاں عورت کے استحصال اور زیادتی کے واقعات سب سے زیادہ ہیں۔ تھامس رائٹس فاؤنڈیشن کی طرف سے کئے گئے سروے کے مطابق خواتین پر تشدد، جنسی زیادتی، ہیومن اسمگلنگ اور جنسی کاروبار میں دھکیلے جانے کی وجہ سے ہندوستان کو عورتوں کے لیے خطرناک ملک قرار دیا گیا ہے۔ اسی سروے کے مطابق افغانستان دوسرے، سیریا تیسرے، چوتھے پر صومالیہ اور سعودی عرب پانچویں نمبر پر ہے۔

امریکہ واحد مغربی ملک جو خواتین کے جنسی استحصال کے حوالے سے اوّل نمبر پر ہے۔ بھارت میں عورت کی جان، عزت سب غیر محفوظ ہے۔ عورت ظلم و جبر کا شکار ہے۔ بھارتی خواتین کو عوامی جگہوں، دفتروں، خاندانوں میں ہراساں کرنا اور جنسی تشدد کا نشانہ بنانا معمول کی بات ہے۔ ان کے لیے ہر جگہ عدم تحفظ کی فضا ہے۔ غرض یہ کہ بھارت ہو یا پاکستان یا کوئی اور مغربی ملک، عورت کو ہر جگہ ہی مشکلات کا سامنا ہے۔ خواتین کے جنسی استحصال کے خلاف سخت سے سخت قوانین تو بنتے ہیں، لیکن ان پر سنجیدگی سے عمل درآمد نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے واقعات میں کمی آنے کی بجائے اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں خواتین نے متھرا عصمت دری کے خلاف زبردست طاقت کا مظاہرہ کیا، جس پر حکومت کو مجبور ہو کر اس معاملے پر غور کرنا پڑا اور عصمت دری کے قوانین میں بھی ترمیم کی گئی لیکن جنسی استحصال کے واقعات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اسی طرح پاکستان میں بھی گزشتہ چند سالوں میں جنسی استحصال کے واقعات میں نمایاں اضافہ

ہو رہا ہے اور مجرم کی پھانسی کی سزا کو ٹال دیا جاتا ہے، کچھ سال کی سزا کے بعد مجرم بری ہو جاتا ہے یا پیسے دے کر قانون ساز اداروں کا منہ بند کر دیا جاتا ہے۔

کشمیر میں بھی خواتین بدترین جنسی استحصال کا شکار ہیں۔ جنسی زیادتی کی شکار عورتوں کا مستقبل کس قدر تاریک ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ وہ موت کو گلے لگانے کو ترجیح دیتی ہیں اور اگر ایسا نہ کر پائیں تو تمام عمر بے حس معاشرے میں بے وقعتی اور ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم خواتین کے عالمی دن کو بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ خواتین کے حقوق کے لیے با آواز بلند تقریروں کرتے ہیں۔ خواتین کو ان کا حق دلانے کی باتیں کی جاتی ہیں لیکن معمول میں آنے کے بعد ہر شخص یہ بات بھول جاتا ہے اور عورت پھر سے استحصال کی چکی میں پستی ہے۔

ہمارے ملک کے علاوہ بھی خواتین کا عالمی دن پوری دنیا میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے اور اب تو یہ دن دنیا بھر میں ایک خاص اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جس میں خواتین پر ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کی جاتی ہے، ان میں شعور و آگاہی بیدار کرنے کے وعدے ہوتے ہیں، فلاحی ادارے اور این جی اوز بھی اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد یہی مثبت تبدیلی منفی رخ اختیار کر لیتی ہے۔ نتیجتاً صنف نازک پھر سے استحصال کا شکار ہونے لگتی ہے۔ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے کا نصف حصہ خواتین کی ایسی اکثریت پر مشتمل ہے جو آج بھی اپنے حقوق سے محروم ہے۔ ان تمام حالات کے پیش نظر ضرورت ہے کہ ان تمام زبانی کوششوں کے ساتھ عملی اقدامات بھی کیے جائیں جو عورت کو استحصال کی چکی سے نکال کر معاشرے کا ایک معزز شہری بنائے۔ برسراقتدار طبقے کو چاہیے کہ ملکی حالات کو دیکھتے ہوئے خالی دعوت کرنے کی بجائے سنجیدگی سے عملی قدم اٹھائے تاکہ عورت عزت اور تحفظ سے زندگی گزار سکے۔ یہ ایک سنگین مسئلہ ہے جسے حل کرنے کے لیے سوچ کو بدلنا ہو گا۔

عالمی یومِ خواتین ۲۰۱۹ء کے موقع پر اقوام متحدہ نے ۲۰۲۰ء تک خواتین کو برابر کے حق دینے، دنیا کے بہترین بنانے میں تعاون کرنے کا ہدف رکھا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ہدف کو کس حد تک پورا کیا جاتا ہے۔ اس ہدف کو پورا کرنے کے لیے معاشرے کے ہر طبقہ کے تعاون کی ضرورت ہو گی تاکہ عورت معاشرے میں خود کو محفوظ سمجھے اور خوف کے سائے سے نکل کر معاشرے میں اپنا بہتر کردار ادا کر سکے۔ جنسی استحصال کی ایک قسم جسمانی استحصال یا جسمانی تشدد ہے جس کا شکار بچے، بڑے، مرد و خواتین سب ہی ہو سکتے ہیں۔ آزاد دائرہ المعارف، ویکیپیڈیا کے مطابق:

"جسمانی استحصال کسی بھی طرح کا ارادی فعل ہے، جو زخم یا ایذا کسی دوسرے شخص یا جانور کو پہنچائے، جو جسمانی ربط کے ذریعے انجام پائے۔ کئی معاملوں میں بچے جسمانی استحصال کے شکار ہوتے ہیں، مگر بالغ لوگ بھی مظلوم ہو سکتے ہیں، جیسے گھریلو تشدد یا کام کی جگہ کی جارحیت۔اس کے لیے مستعمل، متبادل اصطلاحات میں جسمانی حملہ یا جسمانی تشدد ہیں اور اس میں کبھی جنسی استحصال بھی شامل ہو سکتا ہے۔جسمانی استحصال سے مراد ایسا کوئی بھی غیر اتفاقی عمل یا رویہ جو زخم یا ایذا کسی دوسری جسمانی تکلیف پہنچائے"۔(۱۷)

بچوں پر کئی بار استحصالی عمل تب سرزد ہوتا ہے جب ماں باپ بچوں کی سرزنش کے لیے حد سے زیادہ جسمانی سزا دیں۔ بچوں کے جسمانی استحصال کی بات کی جائے تو یہ اس وقت ہوتا ہے جب والدین تربیت کرنے کے صحیح اصولوں سے واقفیت نہ رکھتے ہوں اور تربیت کے معاملے میں خاندانی روایت کی پابندی کریں۔ جس میں بچوں پر سختی شامل ہے اور معمولی غلطی پر مار پیٹ سے کام لینا۔اس طرح کی بے جا سختی اور مار پیٹ جسمانی استحصال کے زمرے میں شامل ہے۔ اس طرح کے استحصال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچے بہت سے شخصی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچوں کا رویہ جارحانہ ہو سکتا ہے اور بالغ افراد جسمانی استحصال کی وجہ سے گھر سے فرار ہو کر منشیات کے عادی بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جذباتی پن، تناؤ کی علامات اور خودکشانہ رجحان ان کی خصوصیات میں شامل ہو جاتا ہے اور جو افراد بچپن میں خود جسمانی استحصال کا شکار رہے ہوں وہ بڑے ہو کر استحصالی رویہ رکھتے ہیں اور دوسروں کو جسمانی ایذا دے کر سکون پاتے ہیں۔

پاکستان سمیت دنیا بھر میں بچوں کو مختلف طریقوں سے جسمانی استحصال کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان مختلف طریقوں میں بچوں کو اغواء کر کے ان کو زبردستی جسمانی مشقت کرانا، مار پیٹ کر جسمانی اعضاء توڑنا، یا گداگری کے لیے جسمانی اعضاء کاٹنا شامل ہیں۔جسمانی استحصال کے یہ تمام طریقے کاروبار کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن ان کی روک تھام کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا رہا۔ سندھ، خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے علاوہ جنوبی پنجاب میں اغواہ برائے تاوان کے بڑے مراکز قائم ہیں۔ یہاں کالعدم تنظیمیں، سماج دشمن افراد بچوں کو اغواہ کرتے ہیں اور ان پر جسمانی اور جنسی تشدد کرتے ہیں۔ اسی طرح جیلوں میں بھی بچوں پر ناروا سلوک کیا جاتا ہے جس میں جسمانی اور جنسی تشدد عام ہے۔

وہ بچے جو مستقبل کے معمار ہیں۔ جسمانی تشدد کا شکار اپنے جسمانی اعضاء کٹوائے سڑکوں اور چوراہوں پر کھڑے بھیک مانگ رہے ہیں یا جبری مشقت کر رہے ہیں۔ ان پھول جیسے ننھے بچوں کے ساتھ روز بروز بڑھتے استحصال کے واقعات کی روک تھام کے لیے معاشرے، والدین اور اساتذہ کو فعال کردار ادا کرنا ہو گا۔ تاکہ ان واقعات کو روکا جاسکے۔ بچوں کے ساتھ ساتھ عورتوں، مردوں کے استحصال کے خاتمے کے لیے بھی اقدامات ہونے چاہیے کیونکہ یہ صرف ایک قانونی مسئلہ ہی نہیں بلکہ سماجی مسئلے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بچے ہمارے معاشرے کا مستقبل اور روشن کل ہیں، ان کے حفاظت کی ذمہ داری معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ کوئی بھی معاشرہ بچوں کے استحصال کو برداشت نہیں کر سکتا۔

بچوں سے مشقت کرانے سے ان کی جسمانی، نفسیاتی، اخلاقی رویہ متاثر ہوتے ہیں۔ اس آنے والے کل کو وہ ایک اچھا شہری بننے میں ناکام رہتے ہیں۔ الغرض ہر معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ہر شہری کو تحفظ فراہم کرے۔ زیادتی واستحصال کرنے والوں کو سزائیں دے تاکہ ایسے واقعات میں کمی واقع ہو۔

iv۔ سماجی استحصال:

انسان پیدا تو آزاد ہوا ہے لیکن اس کرہ ارض پر اس کی آزادی سلب اور غصب کرنے والی قوتیں غالب نظر آتی ہیں۔ ایک معاشرے کا قیام بنیادی انسانی حقوق و فرائض کے تعین سے تشکیل پاتا ہے اور ان حقوق و فرائض کی پاسداری معاشرے کی ترقی کی راہ ہموار کرتی ہے اس کے برعکس انسانی حقوق کا استحصال مختلف سماجی برائیوں اور سانحات کو جنم دیتا ہے۔ ان حقوق کی پاسداری نہ ہونے کی وجہ سے یہ دنیا ظالم و مظلوم ، حاکم و محکوم، جابر و مجبور اور آقا و غلام کے دو طبقوں میں تقسیم ہے، ان میں سے ایک طبقہ استحصال کرنے اور حقوق غصب کرنے والا ہے جبکہ دوسرا طبقہ حقوق سے محروم ہونے والوں کا ہے۔ یوں استحصال کرنے والی قوتوں اور استحصال کا شکار ہونے والے طبقے کے درمیان چپقلش اور جنگ جاری رہتی ہے۔ اس طرح ظلم و جبر کے اس عمل میں اور اپنے حقوق کے استحصال کی روک تھام کے لیے انسان نے بہت سی قربانیاں بھی دی ہیں۔

گھر کے اندر نفسیاتی تشدد کے ساتھ ساتھ عورت کو باہر کی دنیا میں یہی رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ملازمت کی جگہ پر عورتوں کو دھمکانا، انہیں چھیڑنا ان کی ذہنی کشیدگی کا باعث بنتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت مرد کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ عورت کو مرد کی طرف سے ہی سب سے زیادہ جنسی اور ذہنی استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جنسی اور جسمانی استحصال کے واقعات تو عام ہیں لیکن ذہنی یا نفسیاتی استحصال کی طرف کم ہی دھیان جاتا ہے۔ نفسیاتی استحصال کا مطلب ہے کہ اسے مرد کے بغیر غیر محفوظ ہونے کا احساس دلایا جائے،

غیرت کے نام پر کمزور ہونے کا احساس اور قدم قدم پر اسے اس چیز کا احساس دلانا کہ جیسے وہ خطرات میں گھیری ایک مخلوق ہے جسے ایک دن بالا آخر قابو آجانا ہے۔ معاشرے میں مردوں کو فوقیت دینا، اس تمام صورتحال سے عورت نفسیاتی دباؤ یاعدم تحفظ کا شکار رہتی ہے۔اگر ہم سماج کو بدلنا چاہتے ہیں تو عورت کو کمزوری سے فائدہ اٹھانا یا اس کی ذات کو حقیر سمجھنا بند کرنا ہو گا، ورنہ عورت ماضی کی طرح مستقبل میں بھی نفسیاتی استحصال شکار رہے گی۔ عورت کے متعلق اس طرح کے رویے کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں عورت کو سب سے پہلے تعلیم دی جائے، کیونکہ عورت جب خود اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے گی تو بہتری ممکن ہے۔عورت کے علاوہ بھی کسی بھی شخص چاہے وہ مرد ہو یا بچے کو کسی بھی قسم کے خوف میں مبتلا کرنا، اسے ذہنی طور پر پریشان کرنا، ان کا نفسیاتی استحصال ہے۔

اسی طرح معاشی طور پر افراد کو کمزور کرنا ان کا سماجی استحصال ہے۔ معاشی استحصال کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ کسی کو اس کی محنت کے مقابلے میں کم یا انتہائی کم معاوضہ دینا۔

> "Most often, the word exploitation is used to refer to economic exploitation; that is the act of using another Person's labour without offering them on adequate compensation. "
>
> "اکثر، استحصال کا لفظ معاشی استحصال کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ معاشی استحصال یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص کی مزدوری کو مناسب معاوضے کی پیش کش کے بغیر استعمال کرنے کا عمل۔"(۱۸)

معاشرے میں جب تک دولت گردش کرتی رہتی ہے اس وقت تک ہر شخص کو اس کا معاشی حق وصول ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اسی دولت پر کچھ افراد یا طبقے اپنا حق جمانے لگیں تو معاشرے کی صورتحال بگڑنے لگتی ہے اور غریب فرد مسائل کی چکی میں پسنے لگتا ہے۔ معاشی حالات سنگین ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں ایک معاشی نظام رائج ہوتا ہے جس سے کسی بھی معاشرے کی معیشت ترقی یا تنزلی کی طرف جاتی ہے۔ اس حوالے سے اگر سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی بات کی جائے تو یہ غریب عوام کے معاشی استحصال کی جڑ ہے۔ اس نظام میں صاحب سرمایہ سرمایے کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اس کی اس دولت یا سرمایے کی تخلیق میں معاشرے کے بہت سے عوامل کی محنت بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذہب نے سرمایہ دارانہ معاشی نظام پر تنقید کی ہے۔ عمارہ فاطمہ لکھتی ہیں:

"سرمایہ دارانہ معاشی نظام، مادہ پرستی اور افادیت پرستی کے گرد بے روزگاری اور غیر منصفانہ تقسیم دولت کو فروغ دے کر معاشی بحران کا سبب بنتا ہے"۔[۱۹]

اس نظام کے زیر سایہ دولت کے حصول کی تگ و دو بڑھ رہی ہے، دولت کی اس بڑھتی ہوئی خواہش نے انسان کو بہت حد تک مفاد پرست بنا دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے کا استحصال کرنے یا نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ فیکٹریاں، کارخانے میں مزدور اور ملازمین سے خوب کام لیتے ہیں لیکن ان کی محنت کے مقابلے میں اجرت کم دی جاتی ہے۔ مزدور کی غربت و افلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کم اجرت پر زیادہ وقت کام کراتے ہیں۔ وقت پر تنخواہ نہیں دیتے، یہ سب غریب کا معاشی استحصال ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے واضح طور پر دنیا کو دو طبقوں امیر و غریب میں تقسیم کر دیا، امیر نے غریب کا استحصال کرنا اپنا حق سمجھا اور یوں غریب، کمزور طبقے کی معاشی مشکلات میں اضافہ ہونے لگا۔

سرمایہ داری معاشی نظام کے خاتمے کے لیے سوشلزم کا نظریہ آیا۔ اس نظام کے ذریعے طبقاتی استحصال کے تمام راستے بند کر دیے گئے اور عوام مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ جب یہ نظام تیزی سے دنیا میں پھیلنے لگا تو سرمایہ دارنہ نظام کے مفکرین نے مختلف طریقوں سے اس نظام کو ناکام بنانے کی کوشش کی اور بالآخر پھر سے سوشلسٹ ملکوں نے سرمایہ دارانہ معیشت کو پنا لیا۔ یوں ایک بار پھر سے غریب طبقے کا استحصال شروع ہو گیا۔ ظہیر اختر بیدری لکھتے ہیں:

"سرمایہ دارانہ نظام کے سرپرست اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، آج پوری دنیا کرہ ارض پر بسنے والے انسان اقتصادی ناانصافیوں کا شکار ہیں، کوئی مفکر، کوئی فلسفی، کوئی دانشور، کوئی نظریہ ساز دنیا کے انسانوں کو سرمایہ دارنہ کے استحصال سے بچانے کے لیے کوئی فلسفہ کوئی نظریہ پیش کرنے سے قاصر ہے"۔[۲۰]

سرمایہ دارانہ نظام کی بدولت معاشرہ طبقاتی لحاظ سے بھی تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور پھر اسی کی بدولت سیاسی، ثقافتی حتٰی کہ علمی تفریق بھی وجود میں آتی ہے۔ اعلٰی اقدار، جدید تقاضوں کے مطابق رہائش، علاج اور بہترین تعلیم صرف اشرافیہ کے لیے ہوتی ہے۔ جبکہ غریب طبقے کے لیے الگ نظام معاشرے میں قائم ہوتا ہے۔ غریب کے لیے قائم نظام ہر طرح کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہوتا ہے۔ اور جب ملازمت کے مواقع ہوں یہاں بھی اشرافیہ رشوت اور سفارش سے اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔

پوری دنیا میں غریب عوام کا استحصال ہو رہا ہے لیکن پاکستان میں یہ صورتحال اور بھی گمبھیر ہے۔ معیشت کمزور سے کمزور تر اور اس پر قابض طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جاتا ہے اور ٹیکسوں کا بوجھ عوام برداشت کرتی ہے۔ اس معاشی بدحالی کی وجہ یہ ہے کی پاکستان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر بیرونی امداد پر ہے جس کی وجہ سے عالمی سطح پر رونما ہونے والے کسی بھی قسم کے واقعے کی وجہ سے پاکستان کی معیشت متاثر ہوتی ہے۔

انسانی استحصال کی تمام صورتوں کو فرداً فرداً دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ انسانی استحصال کی کوئی بھی صورت ہو وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے۔ جب یہ استحصال حد سے بڑھنے لگے تو معاشرہ تنزلی کا شکار ہونے لگتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ استحصال کا خاتمہ کیا جائے۔ اس کے لیے ہر شخص کو ذاتی کوشش کرنی ہو گی۔ ہر معاشرہ اپنے سے کمتر معاشرے کا استحصال کرتا ہے اور پھر ایک طاقت ور ملک دوسرے ملک کا، طاقتور شخص اپنے سے کمزور کا۔ اس تمام صورتحال سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ طاقت کے ناجائز استعمال کو روکا جائے، آئین میں انسانی حقوق جو مقرر کے جاتے ہیں ان پر عملی اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے کسی بھی معاشرے کے ہر مکتبہ فکر کو سر توڑ کوشش کرنی ہو گی۔

استحصال کے خاتمے کے لیے سماجی انصاف کی ضرورت ہے، سماجی انصاف یہ ہے کہ معاشرے میں امیر اور غریب کا فرق نہ ہو، مرد اور عورت کے حقوق برابر ہو، کسی طاقتور کو کمزور کا استحصال کرنے کی اجازت نہ ہو، استحصال کا خاتمہ تبھی ممکن ہے جہاں تعلیم کے مواقع سب کو برابری کی سطح پر ملیں، قانون ہر کسی پر لاگو ہو، معاشی سطح پر سرمایہ داری نظام کا خاتمہ ہو، وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو، ان تمام عوامل کو درست کرنے سے معاشرے میں کسی کا استحصال نہیں ہو سکتا۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں انصاف کرنا ہو گا۔ حق کا ساتھ دینا ہو گا۔ حق اور انصاف کی عدم فراہمی نے ہمارے سماج کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ قانون بنانے والے ادارے ہی انصاف بیچ رہے ہیں ایسے میں انسانی استحصال کا خاتمہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اسی استحصال کو ختم کرنے کے لیے ہمیں بطور ایک شہری ریاست کے ساتھ مل کر چلنا ہو گا اور ناانصافی کرنے والے کے خلاف آواز بلند کرنی ہو گی تاکہ اس دنیا سے انسانی استحصال کا خاتمہ ہو سکے۔

د۔ ادب میں انسانی استحصال کی عکاسی:

آغاز میں ادب میں ناول کی صنف کو زندگی کی ترجمانی کے لیے چُنا گیا، ادیبوں نے اپنے ارد گرد کے ماحول سے موضوعات اخذ کیے اور ناول کو زندگی سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ اب ناول میں عام زندگی کی

ترجمانی ہونے لگی، اصلاح اور اخلاقی مقاصد کی غرض سے سماج میں پھیلے رسم ورواج، کوتاہیوں اور فرسودہ اقدار پر روشنی ڈالی جانے لگی۔ زندگی کے ترجمان ناول لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام ڈپٹی نذیر احمد کا ہے۔ انہوں نے اپنی اولاد کے لیے اصلاحی ناول لکھ کر اس کام کی شروعات کی۔ پریم چند نے دیہی لوگوں کے مسائل، جاگیر دارانہ نظام کو ادب کا موضوع بنایا۔ عصمت چغتائی اور راجید سنگھ بیدی نے عورتوں کے مسائل اور منٹو نے جنسی مسائل کو موضوع بنایا۔ ترقی کے اس دور میں ایک موڑ اور آیا انسان کی معاشی حالت بدلنے لگی، مشینوں کی ایجاد سے جہاں انسان کو سہولیات میسر آئیں وہیں اس سے بہت سے سماجی مسائل نے سر اٹھایا۔ ایسے میں ان تمام مسائل، حالات و واقعات کو ادب نے اپنے اندر سمو لیا اور دیومالائی دنیا سے ہٹ کر سماج کا عکاس بن گیا۔

ادیب جو کہ معاشرے کا حصہ اور ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو حساس دل اور طبعیت کا مالک اور حالات و واقعات پر گہری نظر رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ ان تمام مسائل کو ادبی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اپنے گہرے مشاہدے اور حساس طبیعت کے باعث ہی وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جب مسائل انتہائی صورت اختیار کرلیں تو انسانی استحصال کا باعث بنتے ہیں۔

ان مقاصد کے پیش نظر اس تحریک کا معاشرے میں گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ بہت سے بڑے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔ یوں اس تحریک کے ذریعے بہت سے ادیبوں نے عوام کے لیے لکھا۔ اور معاشرے میں ہونے والے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس استحصال کے خلاف بہت سے ادیبوں نے لکھا لیکن ہر ادیب کا انداز منفرد تھا، کوئی اس استحصال کے خلاف دھیما لہجہ اختیار کرتا ہے تو کسی کی آواز نعرہ کی شکل اختیار کر جاتی ہے جبکہ کچھ ادیب مزاحمتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہاں ان ادیبوں کے بارے میں ذکر کیا جائے گا جنھوں نے ناول نگاری کے ذریعے انسانی استحصال کی عکاسی کی۔

ہندوستان پر انگریزوں کے قابض ہونے کے بعد دو طبقے وجود میں آئے۔ ایک تھا زمیندار طبقہ اور دوسرا محنت کش مزدور طبقہ۔ دوسرے طبقے کو سرمایہ دارانہ نظام نے خوب بڑھایا۔ تب سے یہی مزدور طبقہ ان سرمایہ داروں کے ہاتھوں اپنا جنسی، جسمانی، معاشی اور اخلاقی استحصال کروا رہا ہے۔ اس تمام صورتحال نے اس طبقے کے دل میں انگریزوں کے لیے نفرت پیدا کر دی، یہ طبقہ کم تعلیم یافتہ تھا لیکن اتفاق و اتحاد کی دولت ان کے ہاں ملتی ہے۔ اس طبقے نے قومی انقلاب میں بھرپور کردار ادا کیا۔ معاشرے میں ہر جگہ اس طبقے کو استحصال کا نشانہ بنایا گیا، ایسے میں ادب نے اس طبقے کی سرپرستی کی اور ان کے مسائل کو سب کے سامنے پیش کیا۔ یوں

ادب میں ناول اور افسانے میں بہت سے موضوعات ان مزدوروں کے متعلق ہیں۔ادیبوں نے کمال خوبی سے ان کے مسائل کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے۔ایسے ادیب جنھوں نے مزدور طبقے پر سب سے زیادہ لکھا ان میں ایک نام پریم چند کا ہے۔

i۔ پریم چند:

پریم چند کا ادبی دور انیسویں صدی کی کی آخری دھائی سے شروع ہو کر بیسویں کی چوتھائی دھائی کے وسط تک تکمیل کو پہنچا ہے۔اس طرح یہ سفر نصف صدی پر محیط ہے۔ہندوستان میں یہ نصف صدی قومی وسیاسی اور اقتصادی لحاظ سے انقلاب کی صدی تھی۔ہر چیز ٹکراؤ اور انتشار کی کیفیت میں تھی۔مغربی ترقی اورروایات ہندوستانی عوام کو اپنی ظاہری روشنی سے گرفت میں لے رہی تھی۔ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے کو اپنی روایات ، نظریات فرسودہ نظر آنے لگے اور وہ مغرب کی تقلید کرنے لگے ،وہ اپنی زندگی کو مغربی رنگ میں ڈھالنے لگے۔لیکن اس کے ساتھ وہ کشمکش کا بھی شکار تھے،ایسے میں معاشرے کے مصلحین متحد ہو کر اُٹھے اور نوجوانوں کے لیے اصلاحی انجمنیں قائم کیں اور نوجوان طبقے نے مغرب سے بیزاری کا اظہار کیا اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔

انہی حالات میں پریم چند کے ادبی سفر کا آغاز ہوا،ان کے ناولوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ پریم چند نے استحصال کرنے والوں کے بجائے استحصال کا نشانہ بننے والوں کا ساتھ دیا۔زمین دار اور کسان کی جنگ میں وہ کسانوں کی راہنمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔پریم چند نے پہلا ناول "اصرار معابد" لکھا اور اس میں سماجی اصلاحات سے متعلق مسائل کو پیش کیا۔مذہب کی اندھی تقلید سے پیدا ہونے والے سماجی مسائل پر روشنی ڈالی۔عورتوں کے مسائل کو بھی ناول کا حصہ بنایا اور مندروں میں عقیدے کے نام پر لُوٹ مار کرنے والوں کو بھی بے نقاب کیا۔دوسرا ناول "ہم خرمہ وہم ثواب" میں بھی عورتوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔مذہب کے نام پر عورتوں کو گمراہ کرنے والوں کو بھی بے نقاب کیا ہے اور عورت کے بیوگی کے مسائل پہ بھی روشنی ڈالی ہے۔

پریم چند کا تیسرا ناول "رُوٹھی رانی" ہے۔اس ناول میں جاگیر دارانہ نظام کے استحصالی رویے دکھائے گئے ہیں۔راجپوتوں کی کہانی بیان کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ ان کے نزدیک عورتوں کی حیثیت ایک گائے کی سی ہے جو مالک کی مرضی کے مطابق پوری زندگی گزاری ہے۔ناول "جلوہ ایثار" میں دیہی زندگی،غریب طبقے کے مسائل اور قدیم و فرسودہ روایات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ناول "گوشہ ءعافیت" میں گاؤں کی زندگی

،افراد کے درمیان لڑائی جھگڑوں سے پیدا ہونے والی صورتحال کو دکھایا گیا ہے اور کسان طبقہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتا دکھائی دیتا ہے۔ قمر رئیس لکھتے ہیں:

"گوشہ عافیت کا منوہر اور اس کا بیٹا بلراج کسانوں کے اس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جو چُپ چاپ ظُلم سہنے کے بجائے مظالم کا مقابلہ کرتے ہوئے مر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔"(۲۱)

ناول "پردہ مجاز" میں اس دور کے سیاسی و سماجی مسائل دکھائے گئے ہیں، ہندو مسلم تنازعے، زمینداروں کی آپس کی کش مکش اور جاگیر دارانہ نظام کے ہوس زدہ رویوں کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ اس ناول کا کردار چکر دھر ایک مثالی کردار ہے اور مزدوروں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ "نرملا" ناول میں پریم چند نے عورتوں کے مسائل، جہیز، بے جوڑ شادی کا ذکر کیا ہے کہ ان تمام مسائل کی وجہ سے پاکیزہ عورت طوائف بن جاتی ہے، جس سے اس کی پوری زندگی ہی تاریک ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ پریم چند نے اپنے ناولوں میں ہندوستان کی معاشی، سیاسی اور عوامی کش مکش کی عکاسی کی ہے۔

ii۔ کرشن چندر:

کرشن چندر نے کافی تعداد میں ناول تحریر کیے اور اپنے ناولوں میں محنت کش کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ناول "شکست"، "سڑک جاتی ہے"، "پانچ لوفر ایک ہیروئن"، "چاندی کے گھاؤ"، "دادر پل کے بچے" اور "باون پتے" ایسے ناول ہیں جن میں ان مسائل کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ محنت کش طبقے کے علاوہ عورتوں کے استحصال کی مختلف صورتیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ کم عمری کی شادی، بے جوڑ شادی اور عورتوں کی خرید و فروخت کے واقعات کو کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ ناول "ایک عورت ہزار دیوانے" میں کردار لاچی کے ذریعے عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر کمال خوبی سے کرتے ہیں کہ لاچی کے ان جملوں سے عورتوں پر ہوئی زیادتیوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ لاچی کہتی ہے:

"اور اس سے بڑا کون ہوتا ہے؟
اور اس سے بڑا خدا ہوتا ہے! خوب چند نے گویا معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔
لاچی چپ ہو گئی۔ دیر تک چپ رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔
اور خدا بھی مرد ہے۔ اس سنسار میں جتنے بھی بڑے بابو ہیں سبھی مرد ہیں، پھر مجھے انصاف کہاں ملے گا"۔(۲۲)

زمانہ قدیم سے رواج چلا آرہا ہے کہ لڑکیوں کو بس ایک گائے کی طرح سمجھا جاتا ہے، ایک کھونٹے سے دوسرے کھونٹے میں اُسے باندھا جاتا ہے لیکن اُسے ہر حال میں چپ ہی رہنا ہے۔ ایسے رواج کو پورا کرنا لڑکیاں اپنا فرض سمجھتی ہیں اور ہر ظلم کو بغیر کسی مخالفت کے برداشت کرتی ہیں۔ عورت کے ساتھ ہونے والے اس ظلم کو کرشن چندر نے ناول "باون پتے" میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کہ عورت صرف بیاہنے، بچے پیدا کرنے اور پھر اُن کی پرورش کے لیے ہی پیدا ہوتی ہے اور ایسا ہزاروں سالوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس عورت پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ صرف دعا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی۔ ناول "شکست" میں کرشن چندر نے سماج میں ناسور کی طرح پھیلتی رواج، ذات پات کو بیان کیا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے عورتوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ذات کے اونچے لوگ اپنے سے کم ذات عورتوں کا جنسی اور جسمانی استحصال کرتے ہیں۔ ایسے تمام مسائل کو مصنف نے اس ناول میں پیش کیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ نظام سراسر غلط ہے اور اس نظام سے پھیلنے والے استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ ناول میں چندرا لڑکی شُدر ذات سے تعلق رکھتی ہے جس کی عصمت دری کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس پر کہا جاتا ہے کہ اس میں کیا بُرا ہے۔ چندرا تو نیچ ذات کی عورت ہے۔ ہندو سماج میں برادری اور ذات پات کے نام پر عورتوں کا جو استحصال کیا جاتا ہے پوری دنیا میں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر نے عورتوں کے ساتھ ہونے والے استحصال کو درد بھرے انداز میں بیان کیا ہے اور اس کی بھرپور انداز میں مخالفت بھی کی ہے۔

اس کے علاوہ عورتوں کی خرید و فروخت، بے جوڑ شادی اور مردوں کے ہاتھوں ذلت جیسے مسائل کو اپنے فن کا حصہ بنایا ہے۔ عورت کے ساتھ ساتھ دیگر عوام کے مسائل بھی اسی طرح ناول میں پیش کیے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں سرمایہ پرستوں اور جاگردارانہ ذہنیت سے ہمیشہ بغاوت کی ہے۔ ناول کے ایسے کردار جو کسی کا استحصال کرتے ہیں انہیں کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ یوں وہ اپنے فن کے ذریعے عوام کے مسائل کو بیان کرتے اور ان کے لیے حل بھی پیش کرتے ہیں۔

iii۔ **عصمت چغتائی:**

عصمت چغتائی نے اپنے فن کے ذریعے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں اردو ناول میں نمایاں مقام حاصل کیا، عصمت نے اپنے ناولوں کے ذریعے معاشرے کے استحصال زدہ طبقے کے لیے آواز بلند کی، لیکن عصمت کا انداز دیگر ناول نگاروں سے منفرد تھا، جس میں بغاوت اور جارحانہ انداز نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے پلیٹ فارم سے قدیم رسموں کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ انہوں نے بہت

سے ایسے نازک موضوعات کو ناول میں پیش کیا ہے جس سے ادبی حلقوں میں بگدڑ مچ گئی۔ ان کے ہاں روایت سے بغاوت اور انحراف نمایاں ہے۔

عصمت نے ناولوں میں جنسی حقیقت نگاری کو پیش کیا ہے۔ نو عمر لڑکیوں کے جنسی مسائل اور ان کی زوال آمادہ قدروں کو دکھایا ہے۔ عصمت نے ناولوں میں بتایا ہے کہ استحصال، عدم مساوات، تنگ نظری، تعصب اور توہمات سماج کا ناسور ہیں۔ نسوانی کرب کو عورت کی نظر سے دیکھا اور ناولوں میں اس کی عکاسی کی۔ عصمت مرد کی جابرانہ اور حاکمانہ برتری کے خلاف تھیں۔ معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم اور عورت کو ذلت و تضحیک کی چیز سمجھنے والے رویے کی مخالفت کی اور مردوں کی بدعنوانی کے خلاف جارحانہ انداز اپنایا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ معاشرے کے ایسے واقعات کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنائیں جن میں طاقتور طبقہ کسی انسان بالخصوص عورتوں پر ظلم کرے اور مذہب یا رسوم و رواج کا سہارا لے کر ان کا استحصال کرے۔

عصمت نے ہر سطح پر بغاوت کا علم اٹھائے رکھا اور تمام عمر حقوق نسواں کے لیے کوشش کرتی رہیں، وہ جاہلانہ رسم و رواج اور باتوں کے خلاف تھیں، بے جوڑ شادیوں کے سخت مخالف تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول کی ہیروئین معاشرے اور مردوں سے اپنا حق مانگتی ہوئی نظر آتی ہے، وہ اپنے حق کے لیے جان دینے کو تیار ہیں لیکن کبھی مظلوم بن کر پیچھے نہیں ہٹتیں۔ شبنم رضوی لکھتی ہیں کہ:

> "عصمت کی ہیروئن تعلیم یافتہ ہو یا گھر کی عورت اپنے حق سے انجان کبھی نہیں رہتی۔"(۲۳)

ان کے ناولوں کے چند کردار اپنی ہمت و جرات کے باعث اُردو ادب میں مثال بن گے ہیں۔ جن میں "ضدی" کی "سیانتا"، "معصومہ" کی "بیگم صاحبہ"، "ٹیڑھی لکیر" کی "شمن"، "دل کی دنیا" کی "قدسیہ خالہ"، "سوداہی" کی "چاندنی"، "جنگلی کبوتر" کی "عابدہ" وغیرہ ایسے کردار ہیں جنہوں نے زندگی کو وسیدھی طرح گزارنے کی بجائے اپنا حق لینے کے لیے الگ راستہ چنا اور اس پر چل کر کامیاب بھی ہوئیں۔

ناول "معصومہ" میں تقسیم کے وقت جاگیر دار گھرانوں پر ٹوٹے والی آفتوں اور پریشانی کا ذکر کیا ہے، ناول میں بتایا گیا ہے کہ معصومہ کے والد تقسیم کے وقت سب کچھ بیچ کر تینوں بیٹوں کو ساتھ لیے پاکستان روانہ ہو گئے اور بیوی کو تین بیٹیوں کے اور چھوٹے بیٹے کے ساتھ ادھر رہنے دیا، معصومہ کی والدہ نے پہلے پہل گھر چلانے کے لیے سامان فروخت کیا، زیورات بیچے مگر پاکستان سے کوئی بلاوا نہ آیا، ایک خط کے ذریعے شوہر

نے اطلاع دی کہ وہ انیس برس کی لڑکی سے شادی کر چکے ہیں اور انہیں بھی وقت آنے پر طلاق دے دیں گے، اس حادثے کے بعد بیگم صاحبہ نے رو پیٹ کر غم و غصہ کا اظہار کیا، ظالم سماج سے اپنا حق مانگتی رہیں مگر کسی نے ان کی آہ و فریاد نہ سنی، اس بات سے اُن کو اندازہ ہو گیا کہ یہ سب بیکار ہے، ان حالات نے ان کے زخمی ضمیر کے اندر ایک باغی عورت کو جنم دیا اور یوں اپنا حق لینے کے لیے جو طریقہ انُھیں مناسب لگا اُس کو اپنایا۔ "معصومہ" جو اس ناول کی ہیروئین ہے کو اس کی ماں طوائف بنانے کا فیصلہ کر لیا اور یوں تمام شرم و لحاظ کو ایک طرف رکھ کر ایک نائیکہ کی طرح بیٹی کا سودا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

جب سیدھی طرح اُن کی بات نہیں سُنی گی تو بیگم صاحبہ نے اپنے لیے خود راستہ نکال لیا۔ یوں انھوں نے اپنے شوہر سے بھی بدلہ لیے لیا کہ اگر وہ انیس کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے تو اُن کی بیٹی اس عمر میں طوائف بن سکتی ہے۔

ناول "دل کی دنیا" میں ایک ایسی لڑکی قدسیہ کی کہانی بتائی ہے جس کی شادی ہوئی تو وہ عام لڑکیوں کی طرح بہت خوش تھی۔ شوہر شادی کے فوراً ً بعد پڑھنے کے لیے ولایت چلا گیا اور واپسی ہوئی تو میم کو ساتھ لے کر آیا یوں خالہ قدسیہ سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوہ جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئیں، ناول کے آغاز میں دکھایا گیا ہے کہ قدسیہ خالہ سیدھی سادی اور معصوم سی ہیں لیکن حالات کے پیش نظر رفتہ رفتہ اُن میں تیزی چالاکی اور جراُت آنے لگی، آہستہ آہستہ وہ اپنے رشتے کے ایک دیور بشیر حسن کی طرف مائل ہونے لگیں، چپ چاپ پڑی رہنے والی قدیسہ، ماں کی ہاں میں ہاں ملانے والی اب بناؤ سنگھار کرنے لگتی ہے۔

اب قدسیہ نے یہ بات جان لی کہ دب کر رہنے سے زندگی کی کوئی خوشی نہیں مل سکے گی اور یہ ظالم دنیا دب جانے والوں کو اور دباتی ہے، دوسروں کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کا کوہی فائدہ نہیں، اپنے مسئلے کے حل کے لیے خود راستہ تلاش کرنا بہتر ہے۔ شبنم رضوی اس کردار کے بارے میں لکھتی ہیں:

> "قدسیہ خالہ نے اس حقیقت کو بھی جان لیا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک نئی پریشانی آتی اور اس پریشانی کے حل لیے نیا راستہ ایجاد کرنا بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسروں سے حق و انصاف کی امید رکھنا بھی بے کار اور فضول ہے اس سماج سے خوشی کی اُمید رکھنا ویساہی جیسے ٹوٹے گھڑے میں پانی جمع کرنے کی اُمید۔"(۲۴)

اب قدیسہ خالہ نے ڈر کر زندگی گزارنی چھوڑ دی، اب وہ بشیر حسن سے کھلے عام باتیں کرتیں، ہنستی مسکراتی، وہ میلے کپڑے پہن کر شوہر کے لیے رونا چھوڑ چکی تھیں، نفیس کپڑے اور چوڑیاں پہنتیں، کسی کے کچھ

کہنے پر ٹوٹ جاتیں۔ ایک دن جب سب گھر والے سو رہے تھے، قدیسہ خالہ نے اس گھر کو چھوڑ دیا جہاں ان کو انصاف دلانے کی بجائے روک ٹوک کی جاتی تھی۔ قدیسہ خالہ نے بھی اپنے لیے انصاف نہ ملنے کی صورت الگ راستہ نکالا، یوں ان کا کردار ان ہزاروں لڑکیوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کے ساتھ ایسے حادثات رونما ہوتے ہیں۔

ناول "باندی" میں امرا اور نوابوں کی عیاشیوں کا ذکر ہے، اُس دور کے جاگیر دارنہ نظام میں باندیاں رکھنے کا عام رواج تھا۔ ان کی خرید و فروخت کھلے عام ہوتی تھی، باندی ان کے گھروں کا کام کرتیں اور کے عیش کا سامان بھی بنتیں ان سب کے باوجود ان کی اولادیں غلاموں سی زندگی بسر کرتی، جائیداد میں سے بھی کچھ نہ ملتا، ایک نواب ایک وقت میں کہیں باندیاں رکھتا ایسے میں بیوی پر کیا گزرتی اس کا ذکر ناول میں کیا گیا ہے۔ آگے چل کر دکھایا گیا ہے کہ ناول کا کردار حرمہ اس کے متعلق سوال اُٹھاتی ہے کہ کیا یہ حق صرف مردوں کا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے کیا لڑکیوں کا بھی حق ہے کہ وہ کئی لڑکوں سے تعلق بنائے۔

حرمہ کے کیے گئے سوال کل کے جاگیر دارنہ نظام میں بھی تھے اور ان کے اس ترقی پسند معاشرے میں بھی، لیکن یہ سب سوال ذہنوں میں ہی منڈلاتے رہتے ہیں لیکن کبھی کوئی حرمہ جیسی جرات مند ان سوالوں کو زبان دے کر اس معاشرے میں عورت کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں ایک مختصر کردار گوری بی بی کا دکھایا گیا ہے، جس کی زندگی ایک نواب نے برباد کر دی، اس کے ہاں بچہ ہوا، اسکا بچہ چاول کی پیچ لے کر بڑا ہو اور نوابزادی کے بچے نے گوری بی بی کا دودھ پیا، اس زمانے میں یہی رواج تھا کہ باندیاں نوابوں کے بچوں کو دودھ پلاتی تھیں لیکن گوری بی بی اس ظلم کو برداشت نہ کر پائی لیکن جب مجبورا ایسا کرنا پڑا تو اس کے اندر بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ بدلہ لینے کا سوچنے لگتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ جس طرح اس کی زندگی نواب کے ہاتھوں برباد ہوئی اسی طرح کسی نوابزادی کی بھی ہو۔

ناول "ٹیڑھی لکیر" ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جس میں معاشرے میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں سے تنگ آکر بغاوت پر اتر آتی ہے، ناول کا مرکزی کردار 'شمن' ہے، بغاوت بچپن سے ہی اس کے اندر موجود تھی۔ اس نے ہر اُس چیز اور بات سے بغاوت کی جسے وہ ناپسند کرتی تھی، شمن کی بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی اسے سمجھ نہیں پاتا ایسے وہ بغاوت اور ضد کے راستے پر چل نکلتی ہے۔ شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں بلکہ ان ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے جو پابندی اور آزادی کے درمیان لٹک رہی ہیں۔ اس ناول کے

ذریعے یہ بات بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ لکیر کیوں ٹیڑھی ہو جاتی ہے، لڑکیوں کے راستے کو الجھانے کے بجائے سلجھایا جائے، اور بجائے غافل بننے کے ان کی راہنما بن کر ان کی مدد کریں۔

ناول کا مرکزی کردار شمن جو نو بچوں کے بعد دسواں اضافہ تھی، ماں باپ کی عدم توجہی کی وجہ سے کج رو بن گئی اور اس میں ٹیڑھا پن آ گیا، یوں اس کی اپنی شناخت مٹنے لگی، وقت گذرنے کے ساتھ شمن کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے رہے کہ اس کے ٹیڑھے پن میں اضافہ ہوتا گیا، وہ اندر اور باہر دونوں طرف سے محبت سے محروم رہی۔ کوئی اس پر توجہ نہ کرتا، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا جس سے وہ محرومی کا شکار ہو گئی، جوانی میں محبت میں ناکامی اور کچھ اور ایسے واقعات جس نے اس کے مزاج کو مزید ٹیڑھا کر دیا، زندگی میں شمن کو کچھ ایسا نصیب نہ ہوا جس سے اس کی اپنی کوئی شناخت بن پاتی، وہ تنہائی اور اکیلے پن میں اپنی تقدیر کو کوستی اور اپنے ارد گرد کو لوگوں کی خوشگوار زندگیوں کو دیکھ کر کُڑھتی رہتی، لیکن شمن نے ان تمام حالات کو برداشت کیا لیکن کبھی اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا نہ سوچا جس سے اس کی ہمت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے، آگے چل کر شمن کی ازدواجی زندگی کا ذکر ہے۔ رونی ٹیلر سے شادی کے بعد اس کا شوہر اس کی بدمزاجی کی وجہ سے اسے چھوڑ کر جنگ پر چلا جاتا ہے۔ ایک بار پھر وہ تنہا رہ جاتی ہے۔ ایسے میں ماں بننے کی خبر نے اس کے اندر کی کڑواہٹ کو ختم کر دیا۔ دراصل "شمن" کے کردار کے ذریعے ناول نگار نے معاشرے کے ان کرداروں پر سے پردہ ہٹایا ہے جو عام طور پر ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔

عصمت چغتائی نے اپنی تحریروں کے ذریعے برصغیر میں پہلی بار عورتوں کے لیے آواز اٹھائی معاشرتی گھٹن اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی، عصمت نے منٹو کی طرح معاشرے کے ڈھکوسلوں اور منافقت کا پردہ چاک کر کے اس کا اصل چہرہ معاشرے کے سامنے لایا ہے۔ پہلی بار انہوں نے باہر کی سچائیوں کے ساتھ انسان کے اندر کی کیفیات، نفسیات اور کرب کو بیان کیا ہے۔ ان کے کردار معاشرے کی نانصافیوں اور ظلم کے آگے کبھی بے بس دکھائی نہیں دیتے، بلکہ وہ اپنے لیے الگ راستہ تراشتے ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی عورت جس کی زندگی گھٹن زدہ تھی عصمت نے اس کے لیے آواز اٹھائی کہ یہ کوئی چابی سے چلنے والی گڑیا نہیں کہ چابی گھومی اور وہ چلنے لگی بلکہ کہ وہ ایک مکمل انسان ہے۔ عصمت نے عورت کے نسوانی کرب کو محسوس کیا اور اپنے تیکھے انداز میں پیش کیا عورت کو تضحیک آمیز شے سمجھنے کی مخالفت کی عورتوں کو معاشرتی پابندیوں سے نکال کر مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا ہنر دیا جو بیسویں صدی کی خواتین کے لئے ایک بڑی خدمت ہے

iv۔ شوکت صدیقی:

پاکستانی اردو ناول نگاروں میں شوکت صدیقی ایسے ناول نگار ہیں جنکے ناولوں میں مظلوم طبقے کی عکاسی بھر پور انداز میں کی گئی ہے۔ شوکت صدیقی ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صحافی بھی تھے اس لئے معاشرتی مسائل کو اپنے ناولوں میں گہرائی سے پیش کیا ہے ان کے دو ناول "خدا کی بستی" اور "جانگلوس" ایسے ناول ہیں جس میں ناول نگار نے معاشرے کے ہر مسئلے کا احاطہ کیا ہے اور استحصالی قوتوں کا مکروہ چہرہ سب کے سامنے لایا ہے۔

ناول "خدا کی بستی" ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آیا اس ناول میں مظلوم عوام کی افسردگی، سماجی جبر، افلاس، معاشی ناہمواری غربت اور استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے، اس ناول میں کراچی شہر اور اس کے باسیوں کی کہانی ہے، اس ناول کا زمانہ قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی دس سال کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ایک ملک نیا نیا قیام میں آیا اور جس کے باسی اپنی آنکھوں میں کچھ خواب لیے بیٹھے ہیں، ان کی بدقسمتی کہ آغاز ہی میں ان کے سب خواب بکھرنے لگے، انصاف، محبت جن کے نام پر ملک بنا تھا، وہ احساسات مٹنے لگے، اسی مناسبت سے مصنف نے اس ناول کا نام "خدا کی بستی" رکھا۔

ناول نگار نے اس ناول میں جرم و تشدد کی فضا کی عکاسی کی ہے جس سے مظلوم عوام کی بے بسی و بے کسی عیاں ہوتی ہے، ناول میں دو مظلوم طبقوں پر ہونے والے ظلم کے واقعات دکھائے گئے ہیں، مظلوم بچوں کا طبقہ اور دوسرا خواتین کا طبقہ ناول کے کرداروں نوشا، راجہ، شامی، انور کے ذریعے پاکستانی معاشرے میں استحصال زدہ طبقے کی اجتماعی صورتحال دکھائی گئی ہے، نوشا، راجہ، جیسے بچے غربت و افلاس کے مارے ہوئے ہیں جنہیں نہ والدین کی محبت ملتی ہے اور نہ ہی بنیادی حقوق میسر آتے ہیں۔ والدین کی تربیت اور مدرسے کی تعلیم سے بھی محروم ہیں۔ ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے ہی خاندان کی ذمہ داریاں اٹھانے لگتے ہیں، ان بچوں کے ساتھ یہ ظلم ہی ہے کہ والدین اور معاشرے ان کے لئے ایسے اقدامات نہیں کر سکا جس سے ان کو زندگی گزارنے کے لئے بنیادی حقوق مل سکیں۔ شگفتہ پروین لکھتی ہیں:

> "شوکت صدیقی نے یہ نکتہ باور کرایا ہے کہ جن معاشروں میں عوام کی بنیادی ضرویات مہیا کرنے کا ریلیف نہیں دیا جاتا وہ نوشا، راجہ، شامی اور انور جیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔"(۲۵)

ناول میں تین بچوں کی کہانی ہے کہ وہ جدوجہد کرتے ہیں بہتر زندگی گزارنے کے لئے، لیکن معاشرے کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملتی، وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن ان سب کے لئے معاشرے نے ان کو مواقع فراہم نہ کیے بلکہ معاشرے نے ان کو مجرم بنا دیا۔ نوشا اور انور دو یتیم بھائی ہیں۔ ان کی ماں بیڑیاں بناتی ہے، نوشا گاڑیوں کی ورکشاپ میں کام سیکھتا ہے، یہی اس گھرانے کی روزی کا واحد ذریعہ ہے۔ غربت کی انتہا تھی کہ جس دن نوشا پیسے نہ لاتا اُس شام اُسے کھانا نہ ملتا، ایک کردار راجہ ہے، جو بے سہارا ہے اور پورا دن آوارہ گلیوں میں پھرتا ہے، شامی باپ کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے، اس کا باپ سخت ہے، معمولی غلطی پر تشدد کی انتہا کر دیتا ہے، نوشا کا چھوٹا بھائی انور ہے جو ابھی کام کے قابل نہیں، لاوارثوں والی زندگی گزار رہا ہے، ماں کے مرنے کے بعد دربدر پھرتا ہے، ہجڑوں کے ساتھ رہ کر بالآخر ہجڑا بن جاتا ہے۔ یہ ان بچوں کی زندگی کے ابتدائی دنوں کی ایک تصویر ہے، یہ تمام بچے ایک ایسے معاشرے کے فرد ہیں جہاں اعلیٰ اقدار ذات کا حصہ نہیں بن پاتی کیونکہ اس معاشرے میں ہر طرف دھوکا ہے اور دوسروں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔

آگے چل کر ایسے حالات ان بچوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ کہ وہ جرائم پیشہ بن جاتے ہیں، انہیں جرم کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے یہ بچے زندہ رہنے سے بہتر مرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ یہ جرم نہ کر سکیں جن پر انہیں مجبور کیا جاتا ہے۔ دراصل ناول کے ان کرداروں کے ذریعے ناول نگار نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ غربت و افلاس کی اندھیر نگری میں پلنے والے بچے نوشا، شامی، راجہ اور انور جیسی زندگی گزارتے ہیں، جرائم پیشہ بن کر جیل جاتے ہیں یا نشے کی حالت میں فِٹ پاتھوں پر بے خبر پڑے رہتے ہیں۔

اس ناول میں دکھائے جانے والا دوسرا مظلوم طبقہ خواتین ہیں جن پر ہونے والے ظلم و جبر کی تصویر کشی کی گئی ہے، دو خواتین رضیہ اور سلطانہ اس مظلوم طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ رضیہ ایک بیوہ ہے اور بیڑیاں تیار کرتی ہے اور بیڑیاں تیار کر کے روٹی کا بندوبست کرتی ہے، سلطانہ بیٹی ہے جو کہ ناول کی ہیروئین ہے کرائے کے مکان میں رہتے ہوئے یہ مظلوم عورتیں عزت سے زندگی گزارنے کے جتن کرتی ہیں، ایک بیٹا کراچی چلا جاتا ہے اور دوسرے کو بھی ماں تعلیم نہیں دلوا سکتی، رضیہ ناول کے ایک کردار نیاز کباڑیے سے اس لیے شادی کر لیتی ہے کہ بچوں کا مستقبل سنور جائے گا مگر نیاز اس کی بیٹی کو حاصل کرنے کے لیے اسے زہر کے ٹیکے لگواتا ہے، زہر کا مقابلہ کرتے اور بیٹی کی شادی کی فکر کرتے رضیہ دم توڑ دیتی ہے۔ رضیہ کی بیٹی سلطانہ بھی ماں کی طرح بدنصیبی کی زندگی گزارتی ہے، بچپن سے ماں کے ساتھ مل کر مزدوری کی، محبت میں ناکامی اور ماں کی موت کے بعد سوتیلے باپ کی ناجائز اولاد کی ماں بن گئی، نوشا واپس آیا تو نیاز کو قتل کر دیا، سلطانہ بیوہ ہو گئی، آخر

میں ایک تنظیم کے سہارے سے اُسے ٹھکانہ ملا، مختصراً یہ کہ اس مظلوم طبقے کو ہر طرح کے ظلم و ستم کا سامنا رہا، اس ناول میں شوکت صدیقی نے ظلم و استحصال کی جو عکاسی کی ہے اس کا مقصد اس نظام حکومت کی طرف توجہ کروانا ہے جہاں جابر حاکم کے لئے کوئی قانون نہیں جبکہ استحصابی قوتیں غریب عوام کا ہر طرح سے خون چوس رہی ہیں، ظلم و جبر اور استحصال کی اس فضا میں جرائم پیشہ معاشرہ ہی پروان چڑھے گا، اس جرائم پیشہ معاشرے کا عکس شوکت صدیقی نے اس ناول میں واضح کیا ہے۔

شوکت صدیقی کا دوسرا ناول "جانگلوس" ہے، اس ناول میں بھی استحصالی قوتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور مظلوم طبقے کی بے بسی دکھائی ہے۔ ناول میں دو مرکزی کرداروں رحیم داد اور لالی کے ذریعے واقعات سے جاگیر دارانہ نظام کی خرابیاں، غریبوں کا استحصال، افسران کی بدعنونیاں اور عورت کی بے بسی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ معزز پری صفت لوگوں کے گھناؤنے روپ دکھائے ہیں جو بظاہر اصلاح کا علم بلند کیے عوام کا استحصال کرتے ہیں، کمزور طبقے کو اپنی لالچ، خود غرضی اور ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ بے گناہ عوام ان کے گناہوں کی سزا جھیلتے ہیں۔

لالی اور رحیم دو جرائم پیشہ افراد ہیں۔ جو جیل میں قید ہیں ناول کے ان کرداروں کا مشاہدہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے۔ کہ یہ مجرم نہیں ہیں بلکہ ان سے جبراً جرم کرائے جاتے ہیں۔ لالی جو بے یار و مددگار ہے اس کا کوئی گھر بار، مال و متاع نہیں، ایک چور ہے لیکن زندہ دلی، صلح رحمی، وطن کی محبت اور بے باکی اس کی صفات ہیں، ہمیشہ دوسروں کے لئے اپنی جان مشکل میں ڈالتا ہے، ظلم کے آگے ڈٹ جاتا ہے، یوں ناول کے ہر قصے میں لالی آتا ہے اور جاگیداروں، وڈیروں کی بدعنوانیوں کا پردہ چاک کرتا ہے۔

ناول میں مصنف نے قانون ساز اداروں کے گھناؤنے چہروں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ بظاہر عوام کو تحفظ فراہم کرنے والے یہ ادارے جرائم کو فروغ دیتے ہیں۔ جرائم کرنے والوں کو ان اداروں کی مکمل پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ ناول میں لالی کا دوست اشرف اپنے گھناؤنے کاروبار اور قانون ساز اداروں سے میل ملاپ کا ذکر کرتا ہے۔ شوکت صدیقی اپنے ناول میں لکھتے ہیں:

> "کوئی خطرناک شرمناک نہیں اشرف نے ہنس کر بتایا مہینے سوا مہینے میں صرف ایک بار نکلتے ہیں اور تگڑا شکار مارتے ہیں، اکیلے نہیں کھاتے مل بانٹ کے کھاتے ہیں اوپر سے نیچے سب کا حصہ بندھا ہے۔"[۲۶]

قانون ساز اداروں کی بد عنوانیوں کے ساتھ ساتھ جاگیر دارانہ نظام کے نقائص کو بھی عیاں کیا ہے۔ کس طرح اس نظام میں کسانوں اور مزارعوں کا استحصال کیا جاتا ہے، اس طبقے کی ہوس کے کئی روپ دکھائے ہیں، جائیداد کے حصول کے لیے اپنوں پر ظلم وستم کی انتہا کر دیتے ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام کا نمائندہ کردار ناول میں حیات وٹو ہے جو زمین کے حصول کے لئے اپنے ہی بھائی کو تہہ خانے میں بند کر دیتا ہے اُسے زہر بھرے ٹیکے لگواتا ہے، مظلوم طبقے کے لئے لڑنے والے لالی کو اس بات کی خبر ہوتی ہے تو وہ اس کے بھائی کو بچا لیتا ہے، حیات وٹو اپنی بیوی کو بھی ترقی کے زینے کے طور پر استعمال کرتا ہے، ناظرہ کو اونچے لوگوں سے تعلقات بنانے کے لیے بہلاتا ہے ناول کا یہ کردار حیات وٹو جاگیر دارانہ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو بظاہر تو مہذب دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا باطن تعفن زدہ ہوتا ہے۔

ناول میں بیوروکریٹ طبقے کی بدعنوانیاں بھی دکھائی گئی ہیں، افسران کا یہ طبقہ کسی بھی طرح کے حالات میں اپنی عیاشیوں میں کمی نہیں آنے دیتے ہیں کلب پارٹیوں میں جنسی بھوک مٹاتے ہیں۔ اپنی خوشیوں میں گم ان افسران کو عوام کا دکھ نظر نہیں آتا، ناول میں ٹرین حادثہ دکھایا ہے کہ ملازم ایس ایس پی کو ٹرین حادثے کی خبر دیتا ہے۔ اس حادثے کا افسر پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ ملازم کو سختی سے منع کرتا ہے کہ اب کوئی فون کال اس تک نہ پہنچائی جائے، اس ناول میں شوکت صدیقی نے بہت سے ایسے واقعات دکھائے ہیں جن میں عوام کی غربت جھلکتی ہے، مجبور عوام اپنا آپ لٹیروں کے پاس گروی رکھنے پر مجبور ہیں۔ ناول میں علی احمد کھوکھر کا کردار ہے جو بھتہ کا مالک ہے جو اپنے ہاں کام کرنے والے مزدوروں کا ہر طرح سے استحصال کرتا ہے احتجاج کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دیتا ہے، مزدوروں کو قید کر کے اپنی مرضی کی سزائیں دیتا ہے، مزدور احتجاج کا حق بھی نہیں رکھتے کیونکہ وہ احتجاج کرنے والوں کا عبرتناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

"خدا کی بستی "ناول کی طرح اس ناول میں بھی عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم کی کرب ناک تصویریں دکھائی گئی ہیں، عورت چاہے اعلیٰ طبقے کی ہو یا کمتر طبقے کی، وہ مظلوم ہی ہے، ”جانگلوس“ ناول میں ناظرہ، زرینہ، طاہرہ، شاداں، جمیلہ، پاروتی عورتوں کے مظلوم طبقے کی نمائندہ ہیں، یہ عورتیں کہیں اپنے خاندان کی عزت کی خاطر خاموش ہیں اور کہیں شوہر کی بربریت نے ان کو مجبور کیا ہے، ناصرہ اور زرینہ جاگیر دار طبقے کی عورتیں ہونے کے باوجود مجبور ہیں اور اپنا استحصال کراتی ہیں، لیکن ان کو اپنے حق میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنف نے ان دونوں ناولوں میں مقتدر طبقوں کی ظلم و بربریت کو نمایاں کیا ہے اور مظلوم طبقے کی بے بسی بیان کی ہے، دونوں ناولوں میں دکھایا گیا ہے کہ مقتدر طبقے کی کمزوریوں کی وجہ سے یہ معاشرہ ترقی نہیں کرپاتا اور مظلوم استحصال کی چکی میں پستے رہتے ہیں جس سے معاشرہ تنزلی کا شکار ہوتا ہے۔

v۔ علی امام نقوی:

علی امام نقوی کا شمار بھی ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی تحریروں میں مظلوم کے لیے آواز اٹھائی۔ ان کا ناول "تین بتی کے راما" ممبئی کے امراء کے گھروں میں کام کرنے والے راماؤں کی کہانی ہے اس ناول میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز اور روزمرہ کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ اس ناول میں تاجروں کے روپے دولت غربت اور استحصال کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری نظام کی حقیقت فاش کی گئی ہے، ناول میں دکھائے گئے راماؤں کے سماجی حالات صرف ان کی ہی نہیں بلکہ یہی مسائل دیگر معاشروں کے مزدوروں اور غریب طبقے کو درپیش ہیں۔ اس ناول میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بظاہر پرسکون نظر آنے والا اعلیٰ طبقہ نفسیاتی اور روحانی سطح پر بے چین ہے، وہ سکون کی تلاش کے لئے شراب کا استعمال کرتے ہیں، جنسی خواہش کے لئے ملازموں کا استعمال کرتے ہیں۔

علی امام نقوی نے طبقاتی کش مکش کو ذرا مختلف انداز میں پیش کیا ہے، پریم چند اور دیگر ناول نگاروں کی طرح سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان کشمکش نہیں بلکہ علی امام نقوی کے ہاں ان دونوں طبقوں میں خاموش معاہدہ قائم ہے جس کے ذریعے یہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ علی امام نے معاشرے کی حقیقتوں کو پیش کرکے انسانی اقتدار کے نام نہاد پاسداروں کا پردہ فاش کیا ہے۔ مختصراً مصنف نے اس ناول میں ممبئی کی معاشرت جنسی اور نفسیاتی محرومیوں نے تناؤ اور کشمکش کو بیان کیا ہے۔

vi۔ الیاس احمد گدی:

ناول "فائر ایریا" کے مصنف الیاس احمد گدی ہیں یہ ناول ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا، اس ناول میں مصنف نے کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں پر ہونے والے ظلم و استحصال، ان کی بے بسی و غربت کول فیلڈ کی دنیا میں قتل و غارت، دھاندلی اور ناانصافی کو موضوع بنایا ہے۔ ناول میں ان مزدوروں کی زندگی کی مکمل عکاسی کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ناول نگار نے سیاسی سطح پر ہونے والی غنڈہ گردی سود خوری اور پولیس کی

مجبوری جیسے مسائل کو بھی دکھایا ہے۔اس ناول کا مرکزی نکتہ استحصال ہے کہ کس طرح محنت کش مزدور طبقے کا ہر سطح پر استحصال کیا جاتا ہے سلمان فیصل لکھتے ہیں:

"مزدوروں کے اس استحصال کی مختلف نوعیتیں ہیں مالک کے ذریعہ مزدوروں کا استحصال، افسروں کے ذریعے مزدوروں کا استحصال، مرد کے ذریعے عورت کا جنسی استحصال غرض کہ ہر جگہ ہر سطح پر استحصال ہی استحصال نظر آتا ہے۔"(۲۷)

استحصال کا یہ سلسلہ آج کا نہیں بلکہ صدیوں سے جاری ہے ناول میں کول فیلڈ میں کام کرنے والوں کی زندگی کی مکمل عکاسی کی گئی ہے، ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح یہ لوگ اپنی آنکھوں میں خواب سجائے اس آگ بھری دنیا میں آتے ہیں ڈھیر سارے پیسے کمانے کی خواہش سے گاؤں میں زمین کا ٹکڑا خریدنے کی حسرت، والدین اور خاندان کی خواہشوں کو پورا کرنے کی آرزو اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانے کا خواب، ان تمام حسرتوں کی تکمیل کے لیئے یہ مزدور دن رات محنت کرتے ہیں، اس کڑی محنت کے عوض جو تھوڑی سی اجرت ملتی ہے کچھ خود خرچ کرتے ہیں اور بقیہ گاؤں بھیجتے ہیں۔ان کی آنکھوں مین سجے حسین خواب کول فیلڈ کی کالی دنیا میں آکر بھیانک شکل اختیار کر لیتے ہیں، ان پر سیاہ دھول کی دبیز تہہ جم جاتی ہے اور مزدور اس کے نیچے دب کر اپنے خوابوں کے ساتھ ہی دفن ہو جاتے ہیں۔

اپنے خوبوں کی تکمیل کے لیے سخت محنت کرتے ہیں اور اس کام میں اس قدر گُم ہو جاتے ہیں ان کے اندر ہر طرح کا احساس مر جاتا ہے، وہ خود پر ہونے والے ہر طرح کے ظلم اور استحصال پر بھی دھیان نہیں دیتے، وہ سب کے سب ایک معمول کی زندگی گزارتے ہیں صبح جاگے گندے تالاب میں اکٹھے غسل کیا، بھات، آلو کھایا اور کام کرنے کے لئے کوئلے کی کان میں چلے گئے، ان کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آتی کوئی احساس، کوئی بغاوت نہیں صبح کے گئے شام کو محنت کر کے آتے ہیں تو ان کا پورا بدن سیاہی میں ڈوبا ہوتا ہے، زیر زمین کام کرتے موت ان کے سر پر منڈلاتی رہتی ہے، لیکن پیٹ کی بھوک انہیں موت کے منہ میں جانے سے نہیں روک سکتی، ناول نگار نے بھوک کو تمام مسائل کی جڑ کہا ہے ان مزدوروں کو نفع نقصان کی پروا نہیں، بس پیٹ کی بھوک مٹانی ہے چاہے وہ ایک سڑے ہوئے آم سے مٹے یہ بھوک ہی انہیں کان کے اندر سینکڑوں فٹ نیچے کام پر مجبور کرتی ہے۔

ناول میں مصنف نے مزدوروں کے دلوں کے خوف کو بھی پیش کیا ہے، کان کے اندر گرم دنیا میں پیش آنے والے حادثات کا خوف ان پر ہمہ وقت مسلط رہتا ہے حادثہ پیش آنے کی صورت میں لاش کو اندر ہی

دفن کر دیا جاتا ہے، لٹیروں، ٹھیکداروں کی جیب گرم کر کے چپ کرا دیا جاتا ہے، یونین، لیڈر، سود خور، لیڈر اپنے تمام غنڈوں کے ذریعے مزدوروں کو خوف زدہ رکھتے ہیں، ان مزدوروں پر ظلم کرتے ہیں ان کی بیویوں، بیٹیوں کی عزت لوٹتے ہیں یوں اُن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی جاتی ہے، اگر کوئی احتجاج کی صلاحیت رکھتا بھی ہے تو انجام دیکھ کر وہ اپنی طاقت اپنے اندر دبالیتا ہے۔ سینکڑوں مزدوروں کے سامنے ایک مزدور پر ظلم ہوتا ہے، کسی میں بولنے کی طاقت نہیں کوئی مخالفت نہیں کرتا، کول فیلڈ میں کام کرنے کی پہلی شرط یہی ہے کہ دیکھو اور سنو سب مگر بولو کچھ نہیں، اس ڈر سے یہ لوگ سہمے رہتے ہیں اور سخت محنت کرتے ہیں، عورتوں کا جنسی استحصال بھی ناول کا اہم موضوع ہے۔ کان میں کام کرنے والی عورتوں کی عزت بھی محفوظ نہیں وہ مردوں کے برابر کام کرتی ہیں۔ ہوس پرست کسی بھی وقت ان کو اپنی ہوس کا نشانہ بنالیتے ہیں، عورتوں کو پتا ہے کہ کول فیلڈ میں مرد ایک بھیڑیا ہے جو کسی بھی وقت ان کی مرضی کے بغیر ان کو ہوس کا نشانہ بنا سکتے ہیں، اور اگر کوئی احتجاج کرے تو اس کے سینے میں گولی اُتار دی جاتی۔ لاقانونیت کے موضوع پر بھی اس ناول میں بات کی گئی ہے، کوئلے کی کان میں صرف ایک قانون ہے اور وہ طاقت کا قانون اور اسی قانون کے بل بوتے پر کمزور کا استحصال ہوتا ہے۔ ناول کا جملہ دیکھیے:

"کول فیلڈ میں بس دو فیکٹر پر کام ہوتا ہے، ایک پیسہ دوسرا طاقت کچھ خاص لوگوں کو پیسہ سے خرید لیا جاتا ہے اور باقی کو طاقت سے دبا لیا جاتا ہے۔"(۲۸)

مزدوروں کو قرض سود پر ملتا ہے یوں سود کی صورت میں بھی ان مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے، وہ کبھی بھی اس قرض کے چنگل سے نہیں بچ سکتے یوں وہ اپنا سودی قرض اپنی اگلی نسل کے کندھوں پر ڈال کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ناول میں استحصال کی مختلف نوعیتوں کے ساتھ ساتھ الیاس احمد نے اس استحصال سے بچنے کا طریقہ بتایا ہے کہ اگر ان مزدوروں کی تربیت کی جائے اور ان کو ان کے حق کے لئے بولنے پر اُکسایا جائے تو یہ بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول نگار نے اس ناول میں مزدور طبقہ کی زندگی، ان کے مسائل اور ان پر ہوتے ظلم و استحصال کی ایک مکمل حقیقی تصویر سب کے سامنے پیش کی ہے۔

vii۔ جیلانی بانو:

ناول "ایوان غزل" جیلانی بانو کا تحریر کردہ ہے جو ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا اس ناول میں مصنفہ نے عورتوں کے حقوق کی حمایت کی ہے اور جاگیردارانہ نظام کی مخالفت کی ہے، جاگیردارانہ نظام میں خواتین کی زندگی کن مسائل سے دوچار ہوتی ہے ناول کے مرکزی کردار ’غزل‘ اور چاند کے حالات سے بخوبی اندازہ لگایا

جا سکتا ہے، ناول کے تمام نسوانی کردار عورت کے استحصال کی عمدہ مثال ہیں، خواتین جو ہمیشہ اپنے فطری حق سے محروم رکھی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ زندگی دوڑ میں سب کے برابر کام کرتی ہیں، آزادی سے قبل عورت ایک غلام کی سی زندگی بسر کرتی تھی۔ بیوی، بہن، بیٹی ہر روپ میں عورت کو پابندیوں اور مجبوریوں کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی تھی عورت کے مسائل ناول کی ہیروئن غزل کے ساتھ بھی پیش آتے ہیں، وہ اپنے باپ کی سخت طبیعت کی وجہ سے کبھی سکون کی زندگی نہیں گزار سکی۔ جس دور میں جیلانی بانو نے یہ ناول تحریر کیا، اس دور میں جاگیر داری نظام زوال پذیر ہو رہا تھا، کسان اپنے حق کے لئے مطالبے کر رہے تھے، ان تمام حالات کا ذکر جیلانی بانو کے اس ناول میں ملتا ہے، غزل اور چاند ناول کے دو نسوانی کردار ہیں جن کی زندگی مسائل کا شکار ہے، غزل کی سادگی کے سبب اُسے نصیر محبت کا جھانسہ دے کر بے وفائی کرتا ہے، چاند کو اس کا ماموں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے، ان دونوں کرداروں کی زندگی ایسے موڑ پر آجاتی ہے کہ دونوں موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ ناول کا ایک اور کردار ''قیصر'' پہلے کے دو نسوانی کرداروں سے منفرد ہے قیصر ایک باغی لڑکی ہے، وہ غزل اور چاند کی طرح گھٹ گھٹ کر زندگی نہیں گزار دیتی بلکہ وہ اپنی باغی طبیعت کے سبب اس نظام سے انتقام لینا چاہتی ہے، وہ معاشرے کی رہنمائی کرنے کے ارادے سے تلنگانہ تحریک کے مجاہدوں کے ساتھ مل کر معاشرے کے فرسودہ نظام کو ختم کرتی ہے، اور نئے مشن کے لئے سرگرم ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ناول حیدر آباد کی سیاسی و سماجی تبدیلی، جاگیر داری معاشرے کی گھٹن اور استحصال کی شکار خواتین کی کہانی ہے، جاگیرداروں اور زمینداروں کی خواتین گھٹن اور بے بسی کا شکار ہیں اور ماتحتوں کی عورتیں ان جاگیرداروں کی ہوس کا شکار بنتی ہیں، ان تمام مسائل کو مصنفہ نے ناول میں کمال خوبی سے پیش کیا ہے۔ استحصال پر بحث کرنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ صدیوں چلا آتا استحصالی نظام معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے، استحصال کی چاہے کوئی بھی صورت ہے وہ بھیانک ہی ہے، اور اگر اس کے خلاف آواز بلند نہ کی گئی تو یہ عمل اسی طرح جاری رہے گا۔ اس استحصال کے خلاف ہمارے بہت سے ادباء نے قلم اُٹھایا ہے، جس سے معاشرے کی صورتحال میں کچھ حد تک بہتری آتی دکھائی دیتی ہے، یہ ادیب ہی ہیں جنھوں نے استحصالی قوتوں کے خلاف اپنے علم بلند کیے اور کمزور طبقے کے لئے آواز اٹھائی یوں عوام میں یہ شعور آیا کہ اپنے حق کے لئے لڑ کر استحصالی قوتوں کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے، مختصراً یہ کہ ادیبوں نے ناول کے ذریعے عوام مسائل کو اجاگر کیا اور ان کا استحصال کرنے والی قوتوں کو سمجھنے کے لئے ایک پلیٹ فارم بنایا۔

حوالہ جات

۱. آزاد دائرۃ المعارف

۲. اردو آکسفورڈ ڈکشنری

۳. فیروزالدین مولوی الحاج (مرتب)، "فیروز اللغات"، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

۴. علمی اردو لغت (جامع)، مرتب وارث سرہندی، ایم اے، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

5. www.plato.standford Encyclopedia of philosophy retrieved on 5th February, 2019 at 1230Hrs

6. https://www.gaatw.org/resources retrieved on 16 January, 2020, at 1700hrs

۷. نعیم قاسم، پروفیسر، "استحصال کی جڑ"، روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۵ فروری، ۲۰۱٦ء

۸. اظہر سلیم، "مذاہب کو استحصال کا ہتھیار نہ بنایئے (کالم)" مطبوعہ نیازمانہ، ۷ لاہور، اپریل ۲۰۱٦ء

۹. دانیال رضا" سوچ کا بلاوکار ہم میں پاکستان"، ۵ نومبر ۲۰۲۰ء، www.chingaree.com

۱۰. راؤ غلام مصطفیٰ، موروثی سیاسی نظام اور جمہوریت، (کالم) مطبوعہ روزنامہ نئی بات، ۲۵ نومبر ۲۰۱۹ء

۱۱. رئیس انصاری، سیاست کی سیاست، www.urdu.geo.tv ۱۰ فروری، ۲۰۱۹ء، ۱۱:۵۰AM

۱۲. رئیس انصاری، سیاست کی سیاست، www.urdu.geo.tv ۱۰ فروری، ۲۰۱۹ء، ۱۱:۵۰AM

13. www.ur.wikipedia.org retrieved 10 February, 2019 at 1730 hrs

14. www.ur.wikipedia.org retrieved 10 February, 2019 at 1730 hrs

۱۵. نادیہ عنبر لودھی، "بچوں کا جنسی استحصال"، www.humsub.com.pk ۱۰ فروری، ۲۰۱۹ء، ۱:۳۰PM

۱٦. رافعہ اعوان، " پاکستانی خواتین اپنے حقوق کی منتظر (مضمون)" ، www.dw.urdu.com ۱۰ فروری، ۲۰۱۹ء، ۱:۳۰pm

17. www.wikipedia.org retrieved on 11 February, 2021 at 1500 Hrs

18. www.psychology.wikia.org 26 March, 2021 at 1745 Hrs

۱۹. عمارہ فاطمہ، "مختلف معاشی نظاموں کے مسائل اور اُن کا حل (مضمون)"، www.hilal.gov.pk/urdu-article ۱۱ فروری، ۲۰۱۹ء، ۰۸:۱۵pm

۲۰. ظہیر اختر بیدری، "سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تحریک"، www.express.pk ۱۱فروری، ۲۰۱۹ء، ۰۸:۳۰pm

۲۱. قمر رئیس ڈاکٹر، "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثت ناول نگار"، دوسرا ایڈیشن سرسید بُک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۲۳ء

۲۲. کرشن چندر، "ایک عورت ہزار دیوانے"، ایشیا پبلیشرز، دہلی، ۹۸۔۱۹۹۷ء

۲۳. شبنم رضوی، "عصمت چغتائی کی ناول نگاری"، نیو پبلک پریس، دہلی ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۰

۲۴. شبنم رضوی، "عصمت چغتائی کی ناول نگاری"، نیو پبلک پریس، دہلی ستمبر ۱۹۹۲ء، ص ۲۰

۲۵. شگفتہ پروین، "شوکت صدیقی کے ناولوں میں مظلوم طبقے کی عکاسی"، مشمولہ اُردو ریسرچ جرنل، شمارہ ۱۱، جولائی تا ستمبر ۲۰۔۲۰۱۷ء، ص ۱۲۰

۲۶. شوکت صدیقی، "جانگلوس (جلد اول)"، کتاب پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۱۹۳

۲۷. سلیمان فیصل، "حاشیائی ادب کا علمبردار ناول، فائر ایریا"، مشمولہ اُردو ریسرچ جرنل، شمارہ ۱۰، فروری تا اپریل ۲۰۱۴ء، ص ۴۳

۲۸. الیاس احمد گدی، "فائر ایریا"، معیار پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء، ص ۱۲۴

باب دوم:

ناول "خلیج" میں انسانی استحصال کا تجزیہ

ادب اور زندگی کا گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح ادب کو معاشرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ادبا معاشرے کے فرد ہونے کے ناطے اپنی تخلیقات میں اپنے اپنے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ یعنی وہ ادب کو معاشرے اور زندگی کے لیے تخلیق کرتے ہیں۔ ایسے ادیب جو ادب برائے زندگی کے قائل ہوتے ہیں انھیں ترقی پسند کہتے ہیں۔ ۱۹۳۵ میں اردو ادب میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا اور ترقی پسند تحریک کے نام سے مشہور ہوئی ابتداء میں اس تحریک کا پر جوش خیر مقدم ہوا۔

"ادب" خواہ کسی بھی زبان کا ہو، سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر ادیب سماج کے تانے بانے کو جوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نظریات مختلف ہوں، راستے الگ الگ ہوں، مگر سبھی انسانی سماج کا راگ الاپتے ہیں، جو جتنا بڑا ادیب ہوتا ہے، وہ اتنی ہی طاقت سے انسان اور انسانی سماج کے حق میں آواز بلند کرتا ہے۔ یہی عکس و نقش اردو ادب میں بھی نمایاں ہے۔ میر ہوں یا غالب، اقبال ہوں یا جوش، پریم چند ہوں یا منٹو سب انسانیت کی بات کرتے ہیں اور انسانی اقدار کو اپنے اپنے رنگ ڈھنگ سے تقویت پہنچاتے ہیں۔

دراصل ناول ایک تاریخی اور تہذیبی دستاویز بھی ہے جس میں زندگی کی مسرت و بصیرت اور غم والم کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس پیش کش میں مختلف کرداروں کی مدد لی جاتی ہے۔ یہ ادب کی واحد صنف ہے، جو ایک مکمل کتاب کی صورت و ہیت میں ہوتی ہے۔ کچھ اردو ناول خاصے ضخیم ہیں مگر ان کی کہانی اور اظہار بیاں اتنا دلکش ہوتا ہے کی قاری اسے ختم کئے بغیر رہ نہیں پاتا۔ جس کی مثال شوکت صدیقی کی ناول "خدا کی بستی" ہے جو طوالت کے باوجود اول تا آخر پڑھنے والے کو اپنے سے الگ نہیں کر پاتی۔ ناول میں تخیل اس دنیا کی حقیقتوں کی بازیافت یا ممکنہ ترتیب و تشکیل کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ناول میں توجہ کا مرکز کردار ہوتے ہیں جن کا تعلق اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سعید احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں نے کس طرح معاشری برائیوں کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "ترقی پسند تحریک نے سماجی زندگی میں تغیر و تبدیلی پیدا کی۔ اس تحریک نے سماج کو رجعت پسندی سے نکال کر ایک نئے سماج کی عمارت کھڑی کی اور اس کے ذریعہ اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا ہوا جس سے ادب زیادہ جاندار اور خوبصورت

ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات زیادہ افسانے اور شاعری پر ہوئے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ ترقی پسند تحریک کے دور میں شعرا اور افسانہ نگاروں کی ہی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان ادیبوں نے ترقی پسند تحریک کے اصول وضوابط پر عمل کرتے ہوئے سماج میں غربت، افلاس، ظلم وستم، بے انصافی، استحصال، جیسی برائیوں پر کھل کر اظہار بھی کیا ہے۔"(۱)

ادب اور سماج کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ ادب سماج سے جنم لیتا ہے۔ ادب ہمیشہ سماج کا ترجمان رہا ہے۔ اسی طرح ادب شعوری اور غیر شعوری طور پر زندگی کی حقیقتوں کا عکاس ہوتا ہے۔ ادب اور سماج ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں سماج کی حقیقتیں اس کے ظابطے اوراس کی روز مرہ تاریخ ادب کی صورت میں آئندہ زمانوں کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے۔ ادب سماج سے پھوٹتا ہے۔ لوگ موسیقی فنون لطیفہ وغیرہ کو بھی ادب کے متعلقات میں شامل کرلیں تو ہم یہ کہنے میں بھی بجاہیں کہ سماج بھی ادب سے پھوٹتا ہے۔ دونوں کی بقا کا انحصار ایک دوسرے پر رہتا ہے۔ جب ہم شکسپیر کے زمانے کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں شیکسپیئر کے عہد میں ادب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ ادب اسی سماج سے پھٹا تھا اسی طرح سے جب ہم لکھنو میں رضی الدین حیدر کے عہد کی تاریخ پڑھتے ہیں یا سراج الدولہ کا دربار دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے کے اندر پیدا ہونے والا ادب یا ادیب زمانہ کا رخ متعین کر رہے ہوتے ہیں ۔ ادب ہو یا سماج دونوں کو سمجھنے کے لئے دونوں کا مطالعہ اور مشاہدہ ازبس ضروری ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

"ادب ایک ایسا سماجی عمل ہے جو زبان اور تخلیق کے حوالے سے بالواسطہ طور پر زندگی معاشرے اور عوام کو متاثر کرتا ہے"(۲)

گویا زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والے عوامل میں سماج شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی عمل میں سماجی شعور بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور کوئی بھی تخلیق کار اپنے عہد سے لاتعلق رہ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ ترقی پسند تحریک نے اس دور کے ادبا و شعرا کو سوشلسٹ نظریے سے غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ کارل مارکس کے اشتراکی نظریہ کی اردو ادب میں ترجمانی کی گئی ہے۔ شاعری، افسانے، ناول، ڈرامے، اور تنقید ترقی پسند نظریہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے جس سے نہ صرف اردو ادب کا فروغ ہوا بلکہ جمہوریت، عوام کی خوش حالی، انسان دوستی، آپسی اتحاد اور ہندوستان کو آزادی دلانے میں بھی مدد ملی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ

مارکسی ادب نے مختلف طبقوں کی حقیقی زندگی کو پیش کر کے انسان کی سماجی زندگی کی ترقی کو اور تیز کر دیا۔
پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

"کوئی ادیب ان ساری ادبی روایات اوران تمام افکاروخیالات سے بے نیاز نہیں
ہو سکتا جو اس کا طبقہ، اس کا شعور، اوراس کا علم سب مل کر اس کے لیے مہیا کرتے ہیں۔
اس نقطہء نظر سے ادب کی حیثیت سماجی اور طبقاتی ہو جاتی ہے "(۳)

ادب سماج اور ماحول کا عکاس ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مختلف زبانوں میں جو ادب پروان چڑھاہے۔ اس میں معاشرے میں ہونے والے واقعات حالات وواقعات اور طرزِ فکر، رسم ورواج کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

الف۔ ناول "خلیج" کا فکری تجزیہ

استحصال مختلف صورتوں میں ہمیں اپنے ارد گرد اور معاشرے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح استحصال اپنا اظہار مختلف شکلوں میں کرتا ہے۔ استحصال کی ان مختلف صورتوں میں سب سے نمایاں صورت انسانی استحصال کی ہے۔ استحصال چونکہ انسان یا اس سے متعلقہ چیزوں کا کیا جاتا ہے اس لیے استحصال کو انسانی استحصال کہنا بجا ہے۔

سیاسی استحصال، مذہبی استحصال، نسلی استحصال، طبقاتی استحصال، جنسی استحصال، جسمانی استحصال، انسانی استحصال کی مختلف صورتیں ہیں۔ استحصال کی ان تمام صورتوں میں ایک مشترک قدر یہ ہے کہ اس سارے عمل کے دوران ایک شخص کا حق مارا جاتا ہے اور دوسرا اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جو سماج میں نابرابری کی بنیاد بنتا ہے اور معاشرہ اونچ نیچ کا شکار ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں بہت سے مسائل سر اٹھاتے ہیں۔ جس میں احساس کمتری اور طبقاتی کشمکش جیسے مسائل نمایاں ہیں۔ یہی کشمش کسی بھی معاشرے میں بد نظمی کی بنیاد ہوتی ہے اور بد نظمی بے چینی کی۔ اس لیے سکون کا متلاشی انسان ہمیشہ سے یہ سوال کرتا آیا ہے کہ آخر استحصال کیا ہے اور یہ کیونکر ہوتا ہے۔ اس استحصال کی وجہ سے کیوں ایک انسان آقا اور دوسرا غلام ہوتا ہے۔ ایک کمی اور دوسرا وڈیرا، جاگیر دار بن جاتا ہے۔ ایک مزدور اور دوسرا سرمایہ دار۔ کوئی ایک نوالے کو ترس رہا ہے اور کسی کے کتے بھی بادشاہوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سرمایہ داری نظام کی بنیاد مسابقت پر ہوتی ہے اور مسابقت میں کامیابی اسی فرد، گروہ یا قوم کو ملتی ہے جو طاقت ور ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز سے اب تک طاقت ور انسان، گروہ اور قومیں کمزوروں کا استحصال کرتی آئی ہیں۔ دنیا میں جس جگہ بھی سرمایہ دار اور جاگیر دار تھے انہوں نے اپنے سے کمزور لوگوں کا استحصال

کیا اور اپنی دولت سے اپنی شان بنائی۔ کارل مارکس نے اس عمل کو سمجھا اور مزدور طبقے کے استحصال کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سرمایہ داری نظام کو بدلا جائے تاکہ سماج سے انسانی استحصال کا خاتمہ ہو۔

بین الاقوامی سطح پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو صورتحال یہ ہے کہ عالمی سیاسی ماحول بھی استحصال کا ہی پس منظر پیش کرتا ہے۔ طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتی ہیں اور ان کا معاشی استحصال کرتی ہیں۔ طاقت ور ممالک اپنے قومی، معاشی اور نظریاتی مفادات کے لیے دوسرے ممالک پر ناجائز اقتصادی پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ دوسرے طاقتور ممالک کی سیاسی مداخلت بھی استحصال کی وجہ بنتی ہے۔

اس کے علاوہ قومی صورتحال بھی اس سے مختلف نہیں ہے ہر کمزور فرد طاقتور کے ماتحت ہے۔ طاقتورادارے اپنے سے کمزور کا استحصال کر رہے ہیں۔ معاشرے میں عدم مساوات ، نا انصافی، فرقہ واریت، مذہب اور دولت کے فرق پر دوسروں کو کم تر ثابت کرنا۔ یہ تمام واقعات استحصال کا سبب بنتے ہیں۔ ایسے معاشرے جہاں قانون صرف کتابوں تک محدود رہے اور صرف غریب قانون کی چکی میں پس رہا ہو، اس معاشرے میں استحصال کئی صورتوں میں دکھائی دیتا ہے۔

ناول "خلیج" کے مصنف خالد فتح محمد اکیسویں صدی کے ممتاز فکشن نگار ہیں۔ اب تک ان کے ۹ ناول، ۵ افسانوی مجموعے اور ۵ تراجم شدہ ناول منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ خالد فتح محمد ایک ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں، ناول نگاری، ترجمہ نگاری، افسانہ نگاری، تنقید اور اس کے ساتھ ساتھ تجزیہ نگاری ان کے نمایاں ادبی اوصاف ہیں۔ "ادراک" کے نام سے ایک ادبی رسالہ بھی نکالتے رہے۔ خالد فتح محمد نے اکیسویں صدی کے آغاز سے ناول نگاری شروع کی، معاشرے میں پایا جانے والا دوہرا رویہ، ظاہر و باطن کا تضاد، عوام کے نام نہاد مسیحا اور ان کی طرف سے عوام پر ہونے والے ظلم و استحصال کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ خالد فتح محمد اپنی تحریروں کے موضوعات کے حوالے سے کہتے ہیں۔

> "میرا اپنا وژن ہے، میرے وطن کے اپنے مسائل ہیں، انہیں کس طرح ایڈریس کرنا ہے؟ حالات کا دھارا کیسے تبدیل ہو گا؟ یہ تمام چیزیں میری تحریروں کا مرکز و محور ہیں" [۴]

خالد فتح محمد عوام کو سماجی، سیاسی، مذہبی قید بندیوں سے آزاد کروا کر ان کے چہروں کو مسکراتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب کوئی معاشرہ سرمایہ داروں اور برسرِ اقتدار طبقے کے ہاتھوں تباہی کی طرف جا رہا ہو تو ایسے میں ادیب اپنے قلم اور تحریروں سے عوام کو آزادی کی راہ دکھاتا ہے۔ خالد فتح محمد کا شمار بھی ادیبوں کے اِسی قافلے

سے ہے جو اپنی تحریروں میں جرات مندانہ انداز میں حق کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کے ناول اور افسانے اس بات کا ثبوت ہیں۔

اردو ناول نے ہر نئے واقعہ کو اپنے پہلو میں جگہ دی اور اس واقعہ کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کیا۔ ۱۸۵۷ء میں معاشرتی و تہذیبی سطح پر زبردست انقلاب آیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ برصغیر نے جہاں کئی خواب آنکھوں میں سجا دیے وہاں قدیم تہذیب دم توڑنے لگی۔ قدیم تہذیب و تمدن شکست وریخت کا شکار ہو گئی۔ ایسے حالات میں ناول نگاروں نے نے تقسیم ہندوستان کے ساتھ ہی انسانی سطح پر ہونے والے مظالم کی داستانیں رقم کرنا شروع کیں۔ کئی نئے موضوعات اردو ناول کا حصہ بن گئے۔ مثال کے طور پر تقسیم، ہجرت، فسادات وغیرہ جیسے موضوعات ناول میں جگہ پانے لگے۔ پاکستان ایک نظریے کے تحت حاصل کیا گیا تھا۔ آزادی کے لیے جو مطالبات روا رکھے گئے وہ کسی نہ کسی حد تک پورے ہو گئے۔

مسلمانوں نے انگریزوں کے تسلط سے آزادی حاصل کی اور ہندوؤں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان پر مشتمل پاکستان کے تمام مسلمانوں کی آرزوؤں کا مسکن بن گیا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان طویل سمندری فاصلہ بھارت کے زیر تسلط تھا۔ قائداعظم نے خشکی کے راستے کا مطالبہ کیا جو پورا نہ ہو سکا۔ دشمن نے آہستہ آہستہ چالاکی سے کام لیتے ہوئے ایک ہی ملک کے لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سانحہ مشرقی پاکستان کی صرف ایک یہ وجہ نہیں ہے کہ بلکہ اس میں پاکستان کے نااہل حکمرانوں کی غلط پالیسیوں کا بھی ہاتھ ہے جو پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں میں اشتراک کا فضا پیدا نہ کر سکے۔ ڈاکٹر زینت افشاں لکھتی ہیں:

> "ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ دونوں طرف کے لوگوں میں ذہنی بُعد پیدا ہو گیا۔ لسانی و گروہی اختلافات عروج پر پہنچ گئے۔۔ ایسے میں ملٹری ایکشن نے نفرت کی سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکا کر آگ لگا دی۔ اس آگ نے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دم لیا۔ برصغیر کی تاریخ میں تقسیم اور ہجرت اہم ترین واقعات ہیں۔ ناول نگاروں نے اس واقعہ کو جس شدت سے محسوس کیا، اسے اردو ناول کا حصہ بنا دیا۔"(۵)

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے الگ ملک بن گیا۔ کئی لوگوں کو دوہری ہجرت کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ اس قومی سانحے نے کئی موضوعات کو جنم دیا۔ ہر ایک ناول نگار نے ناولوں میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ ان ناولوں میں زیادہ تر اس سانحہ کے ذمہ دار افراد اور اسباب و عوامل کا کھوج لگانے کی کوشش

کی گئی ہے۔ خالد فتح محمد نے اپنے ناول میں مشرقی پاکستان میں ہونے والے تلخ حقائق کو بھی پیش کیا ہے۔ اس مقالے کا موضوع بھی مصنف کے دو ناولوں "خلیج" اور "زینہ" میں دکھائے گئے استحصال کا تجزیہ کرنا ہے۔ ان دونوں ناولوں میں بھی مصنف نے عوام کے استحصال کے واقعات کو جرات اور بے باکی سے بیان کیا ہے۔

ناول "خلیج" خالد فتح محمد کا دوسرا ناول ہے جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا، یہ ناول زندگی کے تلخ حقائق بیان کرتا ہے۔ ناول میں مشرقی پاکستان کے المیے کو مصنف نے بغیر کسی تعصب کے اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں بیان کیا ہے، ناول میں ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جو برسرِ اقتدار طبقے کی سیاسی چالوں کی بدولت بغاوت، عدم آسودگی اور استحصال کا شکار ہے۔ مصنف نے سماجی اور سیاسی ناانصافی کو اس تمام تباہی کا محرک قرار دیا ہے۔ یونس خان "خلیج" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "خلیج ایک جنگی ناول تو ہے لیکن یہ سیاسی ناول نہیں ہے۔ یہ ایک سیدھا سا ناول ہے جس میں زندگی کا فلسفہ تو موجود ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ فلاسفروں کا فلسفہ موجود نہیں ہے۔"(۶)

خالد فتح محمد کچھ عرصہ خود بھی مشرقی پاکستان میں رہے، اس لیے وہاں کے حالات اور حقائق سے بخوبی واقف تھے، یوں انہوں نے اپنے ناول "خلیج" میں مشرقی پاکستان کے المیے کا سیاسی، سماجی اور فوجی تجزیہ کیا ہے۔ ناول میں مصنف نے کچھ کرداروں اور واقعات کے ذریعے مختلف موضوعات پیش کیے ہیں۔

ناول "خلیج" ایک سابقہ فوجی کے ہاتھوں کی لکھی تحریر ہے، جس میں حالات و واقعات کو مخصوص زاویہ دینے کے بجائے اس المیے کی تلخ حقیقت کو فنی تجربے اور گہرے مشاہدے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ "خلیج" ناول سقوط ڈھاکہ پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول سے قبل بھی سقوط ڈھاکہ پر کافی ناول لکھے گئے جن میں طارق اسماعیل ساگر کا ناول "کمانڈو"، صدیق سالک کا "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا"۔ لیکن "خلیج" ان سے یکسر مختلف تحریر اس لیے ہے کیونکہ اس میں دو طرفہ حقائق پیش کیے گئے ہیں جبکہ اوّل الذکر ناولوں میں مغربی پاکستان کا موقف سامنے لایا گیا اور مشرقی پاکستان کی عوام کو صرف ظالم کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ جو کہیں نہ کہیں حقیقت سے متصادم ہے۔ ناول کیا ہے سقوط پاکستان کے شب و روز کا مرقع ہے۔ ناول کی تکنیک آپ بیتی سے مشابہ معلوم ہوتی ہے جس میں راوی ایک حساس دل اور غیر فوجی دماغ رکھنے والا لیفٹیننٹ کمانڈر ہے جو کہ کہانی کی ابتدا سے ہی شورش زدہ صوبہ بنگال کی اور حالات کو معمول پر لانے کی اپنی سے کوشش کے واسطے بلائے جانے کی غرض سے رواں دواں دکھایا گیا ہے۔ راوی کا غیر فوجی دماغ کا حامل ہونا بطور خاص قابل ذکر ہے کہ

اس سے ناول میں ایک غیر جانبدار نکتہ نظر سے حالات کے مشاہدہ اور بیانیے کی سہولت پیدا کر دی گئی ہے۔ مصنف کی بنگال کے جغرافیہ، موسم، لوگوں کے مزاج، خوراک، عادات و اطوار اور حالات و واقعات سے جانکاری متاثر کن ہے۔ یوں سمجھئے کہ کوئی انگلی سے پکڑ کر آپ کو بنگال لے گیا ہے اور آپ بنگال کے دیہی و شہری مضافات میں گھوم پھر کر حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتا دیکھ رہے ہیں۔

"خلیج" ناول رومانی خیالات رکھنے والے ایک فوجی لیفٹیننٹ افضل کی جنگی آپ بیتی ہے، ناول چار حصوں پر مشتمل ہے جس کی ابتداء اپریل ۱۹۷۱ء سے کی گئی ہے۔ اظہر حسین اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"ناول کی سب سے بڑی اچھائی یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع کی براہِ راست خارجی تفصیلوں میں سر کھپانے کے بجائے، اپنے مرکزی کردار کے اندر سے باہر کا منظر جھلکاتا ہے"۔[۷]

ناول کی پوری کہانی مرکزی کردار افضل کے گرد گھومتی ہے۔ افضل مثبت سوچ کا حامل، قانون پر عمل کرنے والا آدمی ہے۔ جسے عارضی تقرری پر مشرقی پاکستان بھیجا گیا ہے۔ ان دنوں وہاں علیحدگی کی تحریک اور بغاوتیں عروج پر تھیں۔ افضل ایک حساس دل کا مالک ہے، اس کا رویہ مشرقی بنگال میں پہلے سے موجود مغربی فوجی افسران سے یکسر مختلف ہے، اس کے دل میں بنگالیوں کے لیے بھی نرم گوشہ ہے، لیکن وہ فرض نبھانے پر بھی مجبوراً ہے۔ اس لیے اس کا فرض اور سوچ جگہ جگہ متصادم نظر آتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر بنگالیوں پر ہوئے مظالم پر کُڑھتا ہے۔ ان کے درد کو محسوس کر کے اس درد کی تلافی کی کوشش بھی کرنا چاہتا ہے۔ فرض کی مجبوری سمجھیں یا حالات کی ستم ظریفی کہ وہ انہی لوگوں سے لڑ رہا ہے اور حالات اس نہج پر آ پہنچے ہیں کہ جس میں ایک جسم دو حصوں میں تقسیم ہونے کو ہے۔ مصنف نے ناول میں مغربی فوج کے رویے کو بھی نمایاں کیا ہے، جس کی پوری جھلک اس جملے میں دکھتی ہے۔

"They are the enemy. Kill them, burn them."[8]

ناول کا یہ فقرہ سقوط ڈھاکہ کی مکمل تاریخ کا عکس اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ نفرت، خوف، جبر کی اس فضا کا ایک ہلکا سا عکس ہے، جس نے مشرقی پاکستان کی عوام میں نفرت کو اس قدر بڑھا دیا جس کے نتیجے میں ملک دو دھڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ ناول میں مصنف نے اُن محرکات کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جو سقوطِ ڈھاکہ کا سبب بنے۔ اس ناول کی منفرد بات یہ ہے کہ بغیر کسی تعصب کے غیر جانبداری کے ساتھ دو طرفہ

حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول میں جہاں مغربی پاکستان کی انتظامیہ کی نا اہلی کا ذکر ہے وہیں مشرقی پاکستان کے ہوس زدہ برسرِ اقتدار طبقے کی نااہلیوں اور مفاد پرستیوں کا بھی تذکرہ ہے۔

ناول میں جنگی پہلوؤں کے ذکر کے ساتھ ساتھ مغربی پاکستان کی افواج کی نفسیاتی کیفیات، سوچ، مایوسی اور بے بسی کا ذکر بھی موجود ہے۔ جو گھروں سے دوری اور کشیدہ حالات کی وجہ سے یکسانیت کا شکار ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار افضل بھی اسی کیفیت کا شکار ہو کر اپنے فرض سے انحراف کی راہ پر نکل پڑتا ہے، وہ مقامی لوگوں کے گھروں میں جا کر خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن خود پر اٹھتی سوالیہ نگاہیں اسے ایسا کرنے سے روک لیتی ہیں۔ کرنل بشیر نے افضل سے پوچھا:

"افضل! معلوم ہے کہ تمھیں کہاں بھیجا جا رہا ہے؟

رنگ پور، سر! میں کوشش کروں گا کہ ۲۹ کیولری کے ساتھ رنگ پور میں ہی رہ جاؤں۔

غلط! یہاں آنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ تم انفنٹری کے ساتھ جاؤ اور دیکھو کہ چھاتی پر گولی کیسے روکی جاتی ہے۔ فاخرہ نے تمھاری سفارش کی اور فاخرہ بہت عزیز ہے۔ اوہ اپنی آف شام کریو کے بجائے میرے ہاں گزارتی ہے۔ سو، تم آگے جاؤ اور جنگ کا تجربہ حاصل کرو، یہ خوش نصیبوں کو ہی ملتا ہے"۔ (9)

افضل آغاز ہی سے شورش زدہ صوبہ بنگال کو معمول پر لانے کی کوششیں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا ماننا یہ تھا کہ بنگالیوں کے جارحانہ رویے کے ردِ عمل میں ایسا ہی جارحانہ انداز مناسب نہیں، اس نے سوچ لیا کہ وہ اپنے انداز اور طریقے سے حالات کو بہتر کرنے کی کوشش کرے گا۔

ناول میں جنگی حالات کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس علاقے کا جغرافیہ، موسم، لوگوں کے عادات و اطوار اور خوراک کا تذکرہ بھی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے مشرقی بنگال میں رہتے ہوئے وہاں کے لوگوں اور علاقے کے متعلق کافی جانکاری حاصل کی۔ مشرقی بنگال کی دیہی و شہری زندگی کو دلکش انداز میں پیش کیا۔ طاہر رسول منظر نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

"مصنف کی بنگال کے جغرافیہ، موسم، لوگوں کے مزاج، خوراک، عادات و اطوار اور حالات و واقعات سے جانکاری متاثر کن ہے۔ یوں سمجھیئے کہ کوئی انگلی سے پکڑ کر آپ کو بنگال لے گیا ہے اور آپ بنگال کے دیہی و شہری مضافات میں گھوم پھر کر حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے رونما ہوتا دیکھ رہے ہیں"۔ (۱۰)

منظر نگاری کسی بھی ناول کا اہم عنصر ہوتا ہے۔ "خلیج" میں منظر نگاری بہت عمدہ ہے۔ خالد فتح محمد لکھتے ہیں؛

"ریل گاڑی سست رفتار سے چلتی ہے۔ افضل محسوس کر رہا تھا کہ ڈارئیور محتاط ہو گیا تھا اور کسی قسم کا ناخوش گوار واقعہ اس کے لیے سنگین نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ افضل کو لینڈ سکیپ اداسی میں لپٹا نظر آیا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ حدِ نظر تک پھیلا ہوا یہ منظر اپنے لوگوں کی ذہنی کیفیت اور ان کے جذبات میں مکمل طور پر شامل ہے۔ اسے یہ ان کی ذہنی حالت کا حصہ ہوا۔ اسے اپنا گاؤں یاد آ گیا۔ وہاں بھی اسی طرح حدِ نگاہ تک نظارہ کیا جا سکتا تھا۔"[۱۱]

جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے، جنگ میں ڈوبے علاقے کی تصویریں آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلنے لگتی ہیں۔ ایسے میں ایک مشرقی خاتون یاسمین کی آمد ناول نگار کے غیر جانبدار ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ یہ خاتون ایک مغربی فوجی (جس نے وقت کے بدلتے دھارے کے ساتھ مکتی باہنی سے ہاتھ ملا لیے) کی بہن ہے۔ اس کا کردار ان خواتین کا نمائندہ ہے جو جنگ کے المیے میں اپنے لوگوں اور دشمن کے ہاتھوں اپنی عصمت لٹا دیتی ہیں۔

آگے چل کر اسی عورت یاسمین اور افضل کے درمیان محبت کے جذبے کو پروان چڑھتے دکھایا گیا ہے۔ یوں جنگی المیے کے ساتھ ساتھ ناول میں مرد اور عورت کے فطری جذبے محبت کو طاقتور جذبے کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ جس میں دو مختلف خطوں اور الگ رسوم ورواج کے حامل مرد اور عورت ایک دوسرے کی محبت میں قید ہو جاتے ہیں۔

ناول میں عوام پر ہونے والے ظلم کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ واقعات کے ذریعے دکھایا گیا ہے کہ جنگ کے دنوں میں عوام پر کیا گزرتی ہے، انسانی جانیں کس قدر بے دردی سے ضائع کی جاتیں ہیں۔ مصنف نے غیر جانبداری سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ برسر اقتدار طبقے کی سیاسی نااہلیوں کا نتیجہ بے چاری عوام کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مشرقی و مغربی دونوں کی عوام پر ہوئے ظلم و استحصال کے بہت سے واقعات کو ناول کا حصہ بنایا گیا ہے۔ خالد فتح محمد کے موضوعات کے بارے میں اظہر حسین لکھتے ہیں:

"عام آدمی کے مسائل، عام آدمی کی کاوشیں، عام آدمی کی محبتیں۔۔۔خاص آدمی کی درندہ صفتی، اس سے پھوٹنے والی ناانصافی اور سماج پر اس کے گھناؤنے اثرات وغیرہ ایسے ہی موضوعات ہیں، جنہیں وہ اپنے ناولوں اور افسانوں میں دہراتے ہیں"۔[۱۲]

جنگ کی صورت میں پیدا ہونی والی معاشرتی برائیوں، نفرت، ہوس اور خوف ناول میں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں، عورت کے استحصال کے واقعات بھی موضوع بحث رہے ہیں، جنگ کے دنوں میں وہ اپنے ہی ملک اور اپنے ہی خطے میں غیر محفوظ ہیں۔ بھارتی فوجیوں کا عوام پر تشدد، بہاریوں، بنگالیوں کی آپس کی مخالفت اور اس نفرت کی آگ میں جلنے والے لوگوں کے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ناول میں ایسے کردار بھی دکھائے گئے ہیں جو کسی نہ کسی طرح استحصال کا شکار ہوئے ہیں، ان کرداروں کا ذکر کر کے مصنف نے انسانی استحصال کی بہت سی صورتوں کو اجاگر کیا ہے، تاریخ گواہ ہے کہ جنگی حالات اور برسر اقتدار طبقے کی مفاد پرست پالیسیوں کا خمیازہ انسان کو اپنے استحصال کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ ناول نگار نے افضل کے کردار، اس کی سوچ اور رویے کے ذریعے یہ پیغام دیا ہے کہ اگر نرم رویہ رکھ کر حالات کو سنبھالا جاتا تو نفرت کی یہ خلیج اس قدر نہ بڑھتی کہ ملک دولخت ہو جاتا۔

ناول زندگی کی مکمل عکاسی کرتا ہے اور اپنے کرداروں کے ذریعے سماجی مسائل اور شعور اجاگر کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ناول کی صنف نے دنیائے ادب میں بہت جلد اپنا مقام بنالیا ہے۔ ناول نگار اس کے ذریعے معاشرتی برائیوں سے نہ صرف اپنے قارئین کو روشناس کراتے ہیں بلکہ ان کے حل کے لیے بھی مقدور بھر کوششیں کرتے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ یا پھر برصغیر کے معاشرے ایک ایسے بدن کی مانند ہیں جن پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی بیماریاں سامنے آئی ہیں۔ ضروری ہے کہ افراد معاشرہ کو ان بیماریوں کے بارے میں آگاہی دی جائے۔

دراصل ناول ایک تاریخی اور تہذیبی دستاویز بھی ہے جس میں زندگی کی مسرت و بصیرت اور غم و الم کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس پیش کش میں مختلف کرداروں کی مدد لی جاتی ہے۔ یہ ادب کی واحد صنف ہے، جو ایک مکمل کتاب کی صورت و ہیت میں ہوتی ہے۔ کچھ اردو ناول خاصے ضخیم ہیں مگر ان کی کہانی اور اظہار بیاں اتنا دلکش ہوتا ہے کی قاری اسے ختم کئے بغیر رہ نہیں پاتا۔ جس کی مثال شوکت صدیقی کی ناول "خدا کی بستی" ہے جو طوالت کے باوجود اول تا آخر پڑھنے والے کو اپنے سے الگ نہیں کر پاتی۔ ناول میں تخیل اس دنیا کی حقیقتوں کی بازیافت یا ممکنہ ترتیب و تشکیل کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ناول میں توجہ کا مرکز کردار ہوتے ہیں جن کا تعلق اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں سے ہوتا ہے۔

ب۔ سماجی استحصال:

ادب اور سماج کا رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے اور ترقی پسند ادب سماج کی عکاسی کرتا ہے اور سماجی برائیوں کو ادبی تخلیقات کے ذریعے اجاگر کیا جاتا ہے تاکہ ان برائیوں کی اصلاح کی جاسکے۔ ترقی پسند ادیبوں کا مطالبہ تھا کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس کا تعلق سیاست سے بہت گہرا ہو اور سیاسی مسائل کے ساتھ یہ تحریک سیاست کی پابند بھی تھی۔ سیاست کا پابند ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ترقی پسند ادیب لازمی طور پر سیاسی کارکن بھی ہو۔ اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ ترقی پسند ادیب سیاست سے کنارہ کش نہ ہو۔ ترقی پسند ادیب میں سماج سے گہری ہمدردی، انسان دوستی اور آزادی کا جذبہ ہونا چاہیے۔ ترقی پسند تحریک ادیبوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مزدوروں، کسانوں، کا ساتھ دیں اور ان کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا ایک حصہ بنیں۔ ہنس راج رہبر لکھتے ہیں:

> "ادب، سیاست اور سماج میں بڑا گہرا تعلق ہے اگر ادیب یا شاعر کا سماجی نقطۂ نظر صاف اور واضح نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا سیاسی نقطۂ نظر بھی صاف نہیں ہو گا اور اس حالت میں اس کے ادبی نقطۂ نظر کے صاف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"[۱۳]

اس ضمن میں علی سردار جعفری کا مطمح نظر واضح ہے کہ ادب کا رشتہ سیاست سے گہرا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "دراصل سیاست سے آلودہ ہو کر آرٹ خراب نہیں ہوتا۔ وہ خراب ہوتا ہے آرٹسٹ کی ذہنی اور جذباتی کمزوریوں سے...... جب پریم چند نے اپنے خطبہ صدارت میں یہ کہا تھا کہ ادب سیاست کے پیچھے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ وہ مشعل ہے جو سیاست کو راہ دکھاتی ہے تو وہ ادیب کی انفرادیت اور معاشرے کی اجتماعیت کے رشتے کو ظاہر کر رہے تھے...... اس لیے ادیب کو سیاست کے سمندر میں قطرہ بن کر سمندر کا روپ دھارنے کی کوشش نہیں کرنی چاہے اس کو سمندر میں موتی بن کر رہنا چاہیے اور ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں سیاسی رہنما خود ادیب اور شاعر ہیں۔"[۱۴]

ترقی پسند تحریک ادیب سے سیاست کا مطالبہ اس لیے کرتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ہندوستانی سماج کو آزادی دلانا چاہتی تھی۔ انگریزوں کے ظلم و استبداد کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی تھی۔ ترقی پسند تحریک قومی اور بین

الاقوامی سیاست سے منھ موڑنے سے گریز کرتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادیب وشاعر عملی طور پر سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے لگے۔

وہ معاشرہ سماجی انصاف کا حامل سمجھا جائے گا جہاں تعلیم سب کے لیے ہو اور ایک جیسی ہو، قانون کی ہر صورت عمل داری ہو، کوئی قانون سے بالاتر نہ ہو، معاشی حیثیت کی بنیاد پر چارا دستی نہ ہو، نسل، حسب نسب، مکتب، مذہب، رنگ، علاقے کی بنیاد پر انصاف کے نظام پر اثر نہ پڑے، وسائل کی تقسیم منصفانہ ہو، کسی کو کم کسی کو زیادہ نہ ملے، ایسا بھی نہ ہو کہ کسی کو ملے ہی نا۔ جبر اً کوئی کسی پر بھی قابض نہ ہو، کوئی کسی بھی فرد کی حق ملکیت، اس کی عزت پر اثر انداز نہ ہو، لیکن ان سب عوامل کے علاوہ بھی بہت سے ایسے نکات ہیں جو معاشرے میں انصاف کی عکاسی کرتے ہیں اور انصاف کی اکائی سمجھے جاتے ہیں۔

ناول کے ابتدائی صفحے پر ہی مصنف نے جہاز میں بیٹھے لوگوں کی جو کیفیت بیان کی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جنگی حالات میں عوام کن مشکلات سے دوچار رہتی ہے، وہ جبر اور استحصال سے بھری زندگی کا تصور کر کے پریشان اور سنجیدہ بیٹھے تھے۔ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "بیشتر مسافر سنجیدہ اور پریشان سے نظر آرہے ہیں۔۔۔۔ وہ شاید پرواز کے اختتام پر وقوع پذیر ہونے والی زندگی سے واقف تھے۔۔۔۔ وہ آنے والے دنوں کی کٹھنائیوں اور صعوبتوں میں الجھے ہوئے تھے"۔[۱۵]

مشرقی پاکستان جانے والی اس پرواز میں افضل بھی شامل تھا، ائیر ہوسٹس کی زبانی اس نے سنا جس طرح فلموں میں جنگ کے حالات دکھائے جاتے ہیں کہ گلیاں سنسان ہیں اور چلنے والے اپنے قدموں کی خوفناک گونج سے ڈرتے ہیں، کچھ ایسے ہی حالات ان دنوں بنگلہ دیش کے ہیں، گلیوں میں موت رقص کرتی ہے۔ شورش کے ان دنوں میں مرکزی حکومت کو تولائحہ عمل دیا گیا، لیکن مرکزی کمانڈ کی طرف سے فوجی دستوں کو انسانی جان کے تقدس کے حوالے سے کوئی ہدایت نامہ جاری نہ ہوا اور سب کچھ فیلڈ کمانڈ پر چھوڑ دیا گیا۔ فیلڈ کمانڈ کی طرف سے جارحانہ رویہ رکھنے کا حکم ہوا جنگ کا اصول ہے کہ خواتین، بچوں اور نہتے لوگوں کو نشانہ نہیں بنایا جاتا، لیکن اس اصول کو نظر انداز کر کے عوام پر ظلم وجبر کے پہاڑ توڑے گئے۔

ڈھاکہ کے انتظام وانصرام مغربی فوجی کرنل بشیر کے سپرد تھے، اس کی طرف سے بھی سخت سے سخت رویہ رکھنے کا کہا گیا۔ افضل اس رویے کے مخالف تھا اور وہ ایک ذمہ دار آفیسر کے منہ سے یہ احکامات سن کر دنگ رہ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہی رویہ اپنے لوگوں کے ساتھ روا رکھا جانے کو بولا جائے اور اپنے لوگوں کو

جلانے کا حکم ملتا تو وہ یہ سب کر پاتا۔ مشرقی بنگال کی تقسیم کے حوالے سے جو کتب موجود ہیں ان میں بھی یہ بات درج ہے کہ بہت سے فوجی افسر یا نوجوان اس متشدد رویے سے خائف تھے اور نفسیاتی ہیجان کا شکار تھے، وہ اپنے ہی لوگوں کے خلاف ہتھیار استعمال کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ناول "خلیج" میں بھی افضل اور دیگر جوان افسروں کے اس جوابی جارحانہ عمل کے مخالف تھے، لیکن اپنے فرض کو بھی انہوں نے نبھانا تھا۔ ایک نفرت کا دریا تھا جو بنگالیوں کے خلاف ان کے دلوں میں ابل رہا تھا۔ بریفنگ کے دوران بنگالیوں سے بچنے کے لیے اور ان پر کسی قسم کی نرمی نہ برتنے کا کہتے ہوئے کرنل بشیر بولا:

> " نظر سامنے رکھتے ہوئے ہمیشہ اپنی پیٹھ کا خیال رکھنا۔ بنگالی پیٹھ پر وار کرنے میں بہت ماہر ہے اور یہی اس کا کردار ہے۔ وہ سمجھوتہ کرنے والی بے رحم جنس ہے۔ تم حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد میری بات کی صداقت کو جانوگے "۔ (۱۶)

ایسی اور اسی طرح کی بہت سی باتیں ہر بریفنگ میں افضل کو بتائی جاتیں۔ جس سے وہ اکتاہٹ کا شکار ہو کر حالات کو اپنے طور سے بہتر کرنے کا سوچنے لگا۔ افضل کے ساتھ کے دیگر فوجی بھی ان حالات میں مایوسی کا شکار ہیں، ایک طرف حکم کی ہر صورت بجا آوری اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی جان کا خطرہ، ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ زندگی جب ایک گولی کی دوری پر اور معلوم نہ ہو کب زندگی کی سانسیں تھم جائیں گی تو انسان کی کیفیت اسی تذبذب کا شکار رہتی ہے۔

دشمن سے لڑائی کی صورت میں وہ ان کو شکست دینے کی بجائے اپنا دفاع کر کے بھاگنے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، خوف کے سائے ان پر منڈلاتے رہتے، وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ کسی دوسری طاقت کی مدد کے بغیر وہ مکتی باہنی کو شکست نہیں دے سکتے، یہی ان کی بے بسی تھی، اپنے خاندانوں سے دوبارہ ملنے کی آس و امید انہیں تھوڑا حوصلہ دیئے ہوئے تھی، جس سے وہ اس مشکل وقت کو صبر سے گزار رہے تھے۔ وہ اپنے کاموں کو کرتے کرتے اکتاہٹ کا شکار ہو رہے تھے اور ایک مشین کی طرح چکر پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ان کی وردی، بوٹ اور دیگر استعمال کی چیزیں بھی ان کی طرح بوسیدہ ہو چکی ہیں، وہ اپنے گھر اور لوگوں، ان کی روزمرہ کی گفتگو کو یاد کر کے خود کو حوصلہ دیئے ہوئے ہیں۔ میاں عمران شاہد ناول کے اس پہلو کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ناول میں مصنف نے جہاں دوسرے پہلوؤں پر توجہ دی ہے وہاں مغربی پاکستان سے گئی افواج کی نفسیاتی کیفیات عمل اور ردِ عمل کو بھی مہارت سے پیش کیا ہے۔ جو گھر سے

دوری کی وجہ سے پژمردہ ہیں اور ایک اجنبی علاقے میں ایک اذیت اور تنہائی کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہیں"۔(۱۷)

افضل نے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو اس کیفیت سے نکالنے کا حل سوچا کہ وہ انہیں کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتا، کیونکہ خود کو مایوس کرنے کا مطلب تھا اپنی شکست کو قبول کرنا اور شکست کے نتیجے میں انہیں مشرقی پاکستان میں ہی ختم کر دیا جاتا۔ وہ اپنے فرض کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے دفاع کے لیے بھی مسلسل چلنا چاہتے تھے تا کہ یہ مشکلات کا دور ختم ہو اور وہ واپس اپنی سرزمین پر قدم رکھ سکیں۔ خالد فتح محمد کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک کردار کی کہانی کے ذریعے ایک اجتماعی صورتحال کو پیش کرتے ہیں۔ "خلیج" میں بھی انہوں نے افضل کے کردار، اس کی سوچ، عمل، ردِ عمل اور مایوسی کے ذریعے ان تمام فوجیوں کے مسائل کو اجاگر کر دیا ہے جو اپنے گھروں سے دور ہو کر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے بھی سرگرم عمل رہتے ہیں۔

افضل کے ساتھ کے بہت سے فوجی اس کی طرح اسی امید پر اپنے اپنے حصے کی جنگ کر رہے ہیں تا کہ جلد از جلد اس مشکل دور سے نکل کر واپسی کی راہ اختیار کریں۔ افضل جو اس تمام صورتحال کو ایک الگ سوچ اور زاویے سے دیکھتا ہے، اتنے دنوں کی مغربی فوج کی کارروائیوں اور مکتی باہنی کی بڑھتی خطرناک پیش قدمی کو دیکھتے ہوئے اس نے مغربی پاکستان کی کشیدہ صورتحال اور مغربی فوج کے حالات کو باکسنگ کا مقابلہ قرار دیا اس کا کہنا تھا:

"مشرقی پاکستان میں حالات باکسنگ کے اس مقابلے سے مشابہت رکھتے تھے جس دونوں باکسر گھورتے ہوئے ایک دوسرے کے گرد چکر کاٹتے ہیں اور مخالف کے مُکا مارنے کی اہلیت پر غور کرتے ہیں، وہ جان گیا تھا کہ اُن میں مُکا مارنے کی صلاحیت بھی نہیں رہی"۔(۱۸)

اب ان کا جو بھی قدم ہوتا اس میں حکم کی بجا آوری سے زیادہ اپنے دفاع کا پہلو بھی شامل ہوتا، کیونکہ وہ موت کو کئی بار اتنے قریب سے دیکھ چکے تھے کہ خوفزدہ ہو جاتے، انہیں ہر وقت گولیوں اور توپ خانے کے گولے برسانے کی آوازیں سنائی دیتیں، جن میں سے کوئی گولی انہیں بھی زد میں لے سکتی تھی۔

اپنے ساتھ لائے گئے سامان کی خستہ حالی دیکھ کر سب اور بھی مایوس ہوتے کیونکہ اتنے عرصے میں سامان بھی بوسیدہ ہو چکا تھا، افضل اپنے لباس کو دیکھ کر ماں کو یاد کرتا اور سوچتا کہ شاید وہ یہ لباس معمول کے

دنوں میں دوبارہ نہ پہن سکے، افضل کے کردار میں ان تمام فوجیوں کا عکس جھلکتا ہے جو گھروں سے دور بیٹھے اسی کیفیت کا چکار ہو جاتے ہیں۔

خالد فتح محمد کا کمال ہے کہ انہوں نے ناول میں کوئی لمبی چوڑی فلسفیانہ باتیں نہیں کیں، بلکہ کمال خوبی سے زندگی کے فلسفے کو ناول میں جگہ دی ہے۔ کرداروں کے ذریعے عوام اور گھروں سے دور بیٹھے فوجیوں کی محرومیوں کو گہرائی سے بیان کیا ہے۔ اپنے کرداروں کے ذریعے جنگی صورتحال میں انسانوں پر گزرنے والی کرب ناک کیفیت کو زیرِ بحث لایا ہے، سقوطِ ڈھاکہ پر اس سے پہلے لکھی جانے والی تحریروں میں یک طرفہ خیالات اور صورتحال سامنے لائی گئی ہے، لیکن خالد فتح محمد نے جہاں مغربی لوگوں کو مسائل اور صورتحال پیش کی ہے وہیں وہ مشرقی بنگال کے عوام کے مسائل کو بھی دکھ کی کیفیت سے بیان کرتے ہیں۔ اس تمام صورتحال کو وہ ایک انسانی المیے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ خالد اقبال لکھتے ہیں:

> "مشرقی بنگال کی اس تحریک آزادی کے بارے میں وہ اپنا کوئی نقطہ نظر ضرور رکھتا ہوگا مگر اس نے کسی بھی طرح نظریے کو قاری پر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی بلکہ باتوں باتوں میں اس کی تربیت کی ہے کہ وہ بھی اس انسانی المیے کو انسانی المیے کے طور پر ہے سمجھ سکے کہ انسان حالات کے جبر کے ہاتھوں کس قدر لاچار ہو جاتا ہے"۔[۱۹]

جنگ کے علاقے میں مقیم فوجی اپنے علاقے اور خاندانوں سے دور مایوسی اور کشمکش کا شکار ہیں، جس کی جھلک ہمیں ناول میں افضل کے کردار میں دکھائی دیتی ہے۔ وہ سب وقت، حالات اور احکام کے آگے مجبور ہیں۔ چاہے ان کی مرضی اس میں شامل نہ ہو، لیکن اپنی بقاء اور فرض کے آگے بے بس ہیں۔

ناول میں ایسے ہی ایک کردار کیپٹن غفار کا ذکر ہے، جس نے افضل کے ساتھ ہونے والی گفتگو میں اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا تذکرہ کیا،، کیپٹن غفار نے بتایا کہ اسے شادی سے ایک دن قبل شام کو یہاں بلالیا گیا، اپنے ساتھ ہوئی اس ستم ظریفی کو ہنس کر بیان کر رہا تھا لیکن اس ہنسی میں تلخی کا پہلو نمایاں تھا۔ ناول میں اس واقعہ کا ذکر کر کے ناول نگار نے ان کے ساتھ ہوئے سماجی اور نفسیاتی استحصال کی عکاسی کی ہے، یہ لوگ اپنی مرضی اور رضا مندی کے بغیر حکم کے پابند ہیں، کپٹین غفار دل و دماغ پر شادی کا خیال لیے اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہے، افضل بار بار ایک سوال کرتا کہ اس کے خیال میں یہ شادی ہو سکے گی؟ غفار کی حالت سنگین تھی لیکن وہ اپنا دکھ چھپائے اس جگہ موجود تھا، اپنی ذاتی خوشی کو پسِ پشت ڈال کر اپنا عہد پورا کر رہا تھا۔ بالآخر غفار مشرقی بنگال میں ایک حملے کے دوران شہید ہو گیا۔ غفار کا کردار ان تمام لوگوں کا نمائندہ ہے جو اپنی

خوشیاں چھوڑ کر لامتناہی سلسلے کے ختم ہونے کی آس لیے گھروں سے دور فرض نبھا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں فوجیوں کی اس صورتحال کے متعلق خالد اقبال یاسر لکھتے ہیں:

"۱۹۷۱ء کے بنگال میں بھی عام فوجی محض اپنے تحفظ کی جنگ کسی پچھتاوے یا شرمندگی کے احساس کے بغیر لڑ رہے تھے کیونکہ وہ حالات کے جالے میں اس بری طرح الجھ چکے تھے کہ ان حالات سے فرار ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا"۔ [۲۰]

فوجیوں کی الجھنوں، پریشانیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان مشرقی بنگالیوں کا ذکر کیا ہے جو ان کشیدہ دنوں میں سماجی استحصال کا شکار ہیں۔ بنگالی مرشد علی جو علاقے میں ان دنوں سرگرم تھا۔ مکتی باہنی اور مغربی فوج دونوں کے لیے جاسوس کا کام کرتا، اپنی گفتگو کے دوران اس نے افضل کو دو ایسے گھرانوں کے متعلق بتایا۔ ایک گھر ایسے فوجی جوان کا ہے جس نے ان دنوں مکتی باہنی سے میل ملاپ کر لیا۔ اس کی بہن اور باپ یہاں تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔ مکتی باہنی کے خوف سے اس گھرانے کو کچھ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسرا گھر میجر مسلم کا ہے جو مغربی پاکستان کی فوج میں ہے اور آج کل منگلا میں تعینات ہے۔ مشرقی بنگال میں ان کو پسند نہیں کیا جاتا، یہاں اس کی ماں اور بہنیں خوف اور ڈر کے ساتھ حالات سن کر افضل نے میجر مسلم کے گھر جانا شروع کیا، اس کا مقصد وہاں جا کر ان کو تسلی دینا تھا کہ وہ خود کو محفوظ تصور کریں۔ افضل کے ان کے گھر جانے سے وہ ماں بیٹیاں مزید خوفزدہ ہو گئیں کہ کئی افضل سے علیک سلیک کی بدولت مکتی باہنی کے لوگ انہیں نقصان نہ پہنچائیں۔ ناول میں جس طرح سے اس خاندان کی حالت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے ان کے ڈر اور خوف کی کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

"اسے ہمیشہ میجر مسلم کی والدہ نظر آئیں اسے دیکھتے ہی کانپنا شروع کر دیتیں افضل اشارے سے جو بھی بات کرتا وہ اس کے جواب میں تسبیح کے دانے تیزی سے گھماتیں اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اور بھی زیادہ کانپنا شروع کر دیتیں میجر مسلم کی دو بہنیں بھی تھیں۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے صحن کے کونے میں لگی بوگن ویلا کے پاس کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہتیں"۔ [۲۱]

ایک طرف میجر مسلم کا گھر مغربی پاکستان میں میجر کے قیام پر تشویش کا شکار تھا اور ادھر اپنے علاقے رہتے ہوئے بھی معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ افضل کی وہاں آمدورفت سے ان کا یہ خوف کچھ کم ہوا اور وہ اب افضل سے تھوڑی بہت بات چیت بھی کرنے لگیں۔ افضل بھی وہاں جانے سے خود

کو تازہ دم محسوس کرتا، اپنے گھر سے دوری کا احساس کچھ لمحوں کے لیے اس کے دماغ سے محو ہو جاتا۔ افضل کا میجر مسلم کے گھر جانا اور خود کو پر سکون محسوس کرنا، وہاں مقیم فوجیوں کی تنہائی کے پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور اس تنہائی کو مٹانے کی لیے مقامی لوگوں سے روابط بڑھاتے ہیں۔ مقامی لوگوں سے ملنے والی اپنائیت ان کے دلوں میں چھپی گھر کی یاد کو کم دیتی۔

مکتی باہنی کی کارروائیوں اور آئے دن کے ہنگاموں کی وجہ سے سماجی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی، لوگ گھروں میں مقید اور گلیاں سنسان تھیں، حالات میں بہتری لانے اور لوگوں کی ضروریان کو پورا کرنے کے لیے مغربی کمانڈ نے اپنے علاقے میں ہاٹ بازار دوبارہ سے شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ جس کا آغاز افضل کے علاقے سے ہونا تھا۔ بازار کی حفاظت ایک مشکل مرحلہ تھا، کیونکہ قوی امکان تھا کہ مکتی باہنی کارروائی کر کے لوگوں میں ہراس پھیلا سکتی ہے۔

بازار اور لوگوں کے دفاع کے لیے افضل نے اہم حفاظتی اقدامات کیے تاکہ لوگ دلوں میں ڈر لیے بغیر بازار میں آسکیں۔ بازار کے قیام سے لوگوں کو دوبارہ سے سماجی روابط قائم کرنے اور چیزوں کے لین دین میں آسانی ہونے لگی افضل بازار پر مکتی باہنی کے اچانک حملے سے ہر وقت پریشانی میں رہتا، مکتی باہنی کی طرف سے ذرا سی کارروائی لوگوں کو دوبارہ گھروں میں محصور کر سکتی تھی۔ زندگی کی طرف لوٹنے والے دوبارہ زندگی سے کٹ سکتے تھے، یہ سوچ ہی افضل کے رونگٹے کھڑے کر دیتی۔

افضل کی یہ سوچ سچ ثابت ہوئی اور مکتی باہنی نے بازار میں گولہ پھینکا جس سے بازار میں ہلچل مچ گئی، کوئی جانی نقصان نہ ہوا، لیکن لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا ہو گیا اور مکتی باہنی کا مقصد بھی یہی تھا۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے۔ اس واقعے سے افضل نے خود کو بے بس محسوس کیا۔ ناول میں افضل کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

> "افضل مایوس سا ہو کر واپس سکول چلا گیا۔ اسے لگا کہ اسے شکست ہو گئی ہے۔ مکتی باہنی والے بازار کے بالکل نزدیک سے فائر کر کے کہیں غائب ہو گئے۔ اس نے اپنی شکست سے سمجھوتا کرنے کی کوشش کی مگر فائر کرنے والے نا معلوم افراد کے مسکراتے فرضی چہرے اس کر نظروں کے سامنے آجائے "[۲۲]

ناول کے اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتی باہنی بنگال میں کس قدر طاقت ور تھی جو بغیر کسی ڈر، خوف کے جب چاہے علاقے میں خوف و ہراس پھیلا سکتی تھی۔ لوگوں کی زندگی کو مفلوج بنا سکتی تھی۔ جبکہ

ہزار ہا تدبیریں کرنے کے باوجود مغربی فوج سوائے اپنا دفاع کرنے کے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ مغربی فوج نے لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے اور امن عامہ کو بحال کرنے کے لیے ہزار جتن کیے لیکن مکتی باہنی کی ایک کارروائی اور حملہ پھر سے لوگوں میں خوف وہراس پھیلا دیتی۔

i۔ جان ومال کا زیاں:

بنگال کی تقسیم سے قبل کے کشیدہ حالات اور بغاوتوں میں ان علاقوں میں ہر طرح کی تباہی پھیلائی گئی، کئی جانیں ضائع ہوئیں، گھروں کو نذر آتش کیا گیا، فرضیکہ بہت سا جانی و مالی نقصان ہوا۔ نفرت کی جو آگ مشرقی و مغربی عوام کے دلوں میں جل رہی تھی، اس کے بہت سے بھیانک نتائج سامنے آئے۔ موقع ملتے ہی ہر کوئی دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتا۔ فیلڈ کمانڈر کرنل بشیر کا کہنا تھا کہ اُن کے لوگوں کے ساتھ بھی جو قتل وغارت ہوئی اُس کا بدلہ لینا ہے، جو عزتیں پامال ہوئی اُن کا حساب چکتا کرنا ہے۔ ناول میں ایسے واقعات کا ذکر جس میں بے دردی سے انسانی جانوں کا خاتمہ کیا گیا۔ ان واقعات کے تجزیے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جنگ کی صورت میں نقصان اور استحصال عوام کا ہی ہوتا ہے۔ افضل کی سوچ بھی یہی تھی کہ سوائے انسانی جانوں کے زیاں کے اور کچھ ہاتھ نہیں انا۔ یہی علیحدگی اگر پُرامن رہ کر کی جاتی تو ایسے انسانیت سوز واقعات رونما نہ ہوتے۔

ان تمام حالات میں ایک عام فوجی بے بس تھا، جو افضل کی صورت میں ناول میں دکھائی دیتا ہے۔ خلیج ناول سے اگر ہٹ کر بات کی جائے تو مشرقی بنگال کی تقسیم پر لکھی جانے والی تاریخ کی کتب میں بھی یہ باتیں درج ہیں جن میں انسانی جانوں کے زیاں کا تذکرہ ہے۔ اور یہ کہ اپنے ہی لوگوں سے برسرپیکار فوجی اس ظلم کے حق میں نہ تھے۔ لیکن وہ حکم کے پابند تھے، حالات کو پرامن رکھنا؛ عام فوجی کے بس کی بات نہیں تھی لیکن حکم صادر کرنے والے اس بات کا فیصلہ کر سکتے تھے کہ لوگوں کو کچلے بغیر بھی تقسیم ممکن تھی۔

فیلڈ کمانڈر کرنل بشیر تشدّد کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا تھا، کیونکہ خود اس کا گھرانہ اسی ظلم کا شکار ہو چکا تھا، عوامی لیگ کے کہنے پر جو بغاوت ہوئی، اس میں کرنل بشیر کی بیوی کو بازار میں قتل کر دیا گیا۔ ناول نگار اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "وہاں اُن پر حملہ ہوا۔ اُن کے بازو اور ٹانگیں دھڑ سے جُدا کر دی گئیں اُن کے محافظ بھی مارے گئے"۔ [۲۳]

خود پر ہوئے اس ظلم پر کرنل بشیر بدلے کی آگ میں جل رہے تھے اور ہر مغربی خاتون کے ساتھ ہوئی زیادتی کا بدلہ لینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خود کے ہوئے اس استحصال کا بدلہ وہ مشرقی پاکستان کے ہر فرد سے لینا چاہتے تھے اور کسی قسم کی نرمی کے حق میں نہ تھے۔

ناول نگار نے مغربی اور مشرقی عوام کے دکھ کو بغیر کسی تعصب کے انسانی المیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ جہاں وہ مغربی عوام پر ہوئے ظلم اور مغربی فوجیوں کی مایوسیوں کا تذکرہ ہیں، ساتھ ہی مشرقی بنگالیوں پر ہوئے ظلم کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ آزادی اور تقسیم کے اس چکر میں دونوں طرف کی عوام کو ہی سنگین نتائج بھگتنا پڑے۔ کیونکہ بدلے کی آگ نے ان لوگوں کو اندھا کر دیا تھا، وہی فوجی جنہوں نے ملک و قوم کی سلامتی کے حلف لیے تھے، آج عوام انہی کے ہاتھوں مولی گاجر کی طرح کٹ رہی تھی۔ یہ ظلم صرف مغربی فوج کی طرف سے نہ تھا بلکہ موقع ملنے پر مشرقی پاکستان کے لوگ بالخصوص جس کے ساتھ مکتی باہنی کے لوگ شامل تھے، بھی بدلہ لیتے، بے دردی سے لوگوں کو قتل کرتے۔ عوامی لیگ کے کہنے پر جو بغاوت ہوئی، اس میں بچوں اور عورتوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔ اُن واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ناول نگار لکھتے ہیں:

> "جو واقعات سننے میں آئے، وہ انسان کے غیر مہذب ہونے کی گواہی تھے۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔۔۔ مُردہ جسموں میں جھنڈے گاڑ کر آزادی کا جشن منایا گیا"۔ (۲۴)

ملک میں جاری بغاوت میں جو انسانیت سوز واقعات پیش آئے اس کو روکنے کے لیے فوج کو اپنی عوام سے صَف آرا ہونا پڑا۔ ان کا دل و دماغ اس عمل پر رضامند نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں جگہ جگہ افضل کی سوچ اپنے افسرَان سے منفرِد نظر آتی ہے۔ کرنل بشیر جیسے سینئر افسر کے گفتگو سن کے بھی وہ اسے قابل رحم نظروں سے دیکھتا اور سوچتا کہ شاید خود کے ساتھ ہوئے ظلم کے بعد کرنل بشیر بدلہ لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

ناول میں ان واقعات کے ذریعے ایک اہم نقطہ اجاگر کیا ہے کہ آج کا انسان خود کو مہذب سمجھتا ہے لیکن حقیقتاََ وہ پتھر کے دور سے آگے نہیں بڑھ سکا، اس کے ظلم کرنے کے طریقے وہی ہیں جو نازیوں نے دوسری جنگِ عظیم میں اختیار کیے۔ ہندوپاک کی تقسیم میں بھی یہی اندازِ ستم دیکھنے کو ملے، لیکن افضل اس تاریخ کو دہرانے کے خلاف تھا۔ وہ کسی بھی قسم کے استحصال کے خلاف تھا، لیکن یہ سب روکنے کے لیے اس کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا۔ یوں وہ فرض اور سوچ کے درمیان خود کو جھولتا محسوس کرتا ہے۔

ناول میں ایک مقام پر افضل اور اس کے ہم رتبہ کی گفتگو کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ دونوں بنگال کی صورتحال پر اپنا اپنا موقف پیش کررہے تھے، افضل کا کہنا تھا کہ یہ لوگ اپنے ہی ہیں، بس بھٹک گئے ہیں، ان کو اعتماد میں لے کر بہتری لائی جاسکتی ہے۔ اس کے برعکس شہباز نے اس کی گفتگو پر شدید ردعمل کا اظہار کیا، اس کے لہجے میں ان لوگوں کے لیے نفرت بھری تھی۔ جس کا مظاہرہ اس نے ریل میں سوار دو بنگالیوں پر فائر کھول کر کیا۔ اس نے کہا جو ہم یہاں کریں گے وہی یہاں کا سسٹم ہو گا۔ شہباز نے ایک بنگالی کو ڈبے کے دروازے پر باہر کی طرف منہ کر کے کھڑا کیا اور اس پر فائر کھول دیا۔ افضل اس تمام صورتحال کو دیکھ کر شدید دکھ میں تھا، اس کی کیفیت اور سوچ کو ناول نگار نے اِن الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔

"افضل سکتے میں آ گیا، وہ انسانی زندگی کو اس کائنات کی سب سے مہنگی چیز سمجھتا تھا،
اُسے اس کے اس قدر ارزاں ہونے پر دکھ ہوا اور حیرت بھی۔"(۲۵)

شہباز نے ایک اور بنگالی کو دروازے میں کھڑا لیکن فائر کُھلنے سے پہلے ہے وہ "جے بنگالا" کا نعرہ لگا کر دریا میں کُود گیا۔ ریل میں موجود باقی کے لوگ خوفزدہ چہرے لیے یہ سب دیکھتے رہے، ناول میں انسانی جانوں کے ارزاں اور بے وقعت ہونے کے بہت سے واقعات دکھائے گئے ہیں۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ ان تمام واقعات کو غیر جانبداری سے بیان کیا ہے۔ خود کوئی فیصلہ سنانے کے بجائے یہ کام اپنے کرداروں سے لیا ہے، لمبے چوڑے فلسفے سے گریز کرتے ہوئے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جنگ و جدل میں نقصان انسانیت کا ہے، ان حالات میں عام انسان ہی ظلم کی چکی میں پستا ہے۔ یہی تمام مسائل، انسانی جانوں کی کم مائیگی کو ناول "خلیج" میں اُجاگر کیا گیا ہے۔

پیر گنج کے علاقے میں افضل کی موجودگی کے دنوں میں مکئی باہنی کی کاروائیاں بڑنے لگیں وہ رات کو کسی دیہات میں چھاپہ مارتے، امیروں کو لوٹتے، کئی گھرانوں کی عزتوں کو اپنے ساتھ لے جاتے، ان کی کارروائیوں کو روکنے سے زیادہ فوج یا لوگ اپنے دفاع کے لیے فکرمند تھے، کیونکہ پکڑے جانے والے فوجیوں کو بے دردی سے قتل کر دیا جاتا تھا۔

ایسی ہی ایک کاروائی مکئی باہنی نے بریگیڈ کے ایک کانوائے پر کی، اس حملے میں مغربی فوج کے دو افسر مارے گئے، جن میں ایک کیپٹن غفار شامل تھا۔ وہ کیپٹن جو اپنی شادی چھوڑ کر یہاں آیا اور مکئی باہنی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ غفار جو اپنی شادی کا خیال اور خوشی لیے اپنے فرض کی ادائیگی کر رہا تھا کہ اچانک اس کی موت کی

خبر آ گئی۔ انسان کی زندگی کی سے بڑی ستم ظریفی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے خوشیوں بھرے لمحات حاصل کرنے کے قریب ہو اور موت اُسے اپنی آغوش میں لے لے، یہی سب کیپٹن غفار کے ساتھ ہوا۔

ii۔ ظلم و بربریت:

ناول میں جگہ جگہ ایسے واقعات نظر آئے ہیں جن میں ظلم و بربریت کے مناظر کی عکس بندی کی گئی ہے۔ بغاوت میں صوبے کی چھاؤنیوں پر ہجوم نے حملے کیے۔ ہجوم کو روکنے کے لیے فوجیوں کے پاس اسلحہ ناکافی تھا۔ حالات کو اپنے قابو میں کرتے ہی انہوں نے فوجیوں اور باقی افراد کو بے دردی سے کاٹ کر رکھ دیا۔ وہ فوجی جنھوں نے ملک کی سلامتی کے لیے جان قربان کرنے کا حلف لیا تھا وہ اُسی ملک کو دولخت کرنے کے درپے ہو گئے۔ ہر کوئی بدلے کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس صورتحال کو ناول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

> " نفرت کا ایسا دریا تھا ت جس کے کنارے آگ کے بنے ہوئے تھے۔۔۔ یہ فوجی اپنے ہی مُلک میں ایک عجیب نوعیت کے آپریشن میں مبتلا ہو گئے، ان کے سامنے صرف ایک ہی آپشن تھا اور وہ تھا بدلہ "۔[۲۵]

ریل میں بنگالیوں کی جان کے زیاں اور اس طرح کے اور واقعات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شہباز اور اس جیسی سطحی سوچ رکھنے والے انسانیت کی تذلیل کر کے خلیج کو مزید بڑھا رہے ہیں۔ صرف اپنی انّا کی تسکین کے لیے اس قسم کے بے ہودہ اعمال سر انجام دے رہے ہیں۔ ان حالات میں افضل نے سوچا کہ کیا وہ بھی اس المیے کا حصہ بن جائے گا یا حالات کی بہتری کے لیے الگ راستہ اختیار کرے گا۔ ناول میں بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں پر ہوئے ظلم کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ عورتوں کی عصمتیں پامال ہوئیں، بغاوت کے دِنوں کی صورتحال کا زکر کرتے ہوئے ایک ریلوے اسٹیشن کا منظر دکھایا گیا ہے کہ یہ لاشوں سے بَھرا پڑا تھا، لوگوں کو محفوظ جگہ پہنچانے کا جھانسہ دے کر سب کو گھیر کر مار دیا گیا۔

ناول میں ہر کردار کی سوچ، جملے اور خیالات کے ذریعے مصنف نے بتایا ہے کہ یہ نفرت، خوف اور تشدّد کی ایسے فضا تھی جس نے دونوں فریقین کے دلوں میں خلیج پیدا کر دی۔ نفرت کی اس آگ کو بُجھانے کے لیے جس کو موقع ملتا وہ ظلم و بربریت کی انتہا کر دیتا۔ ہر بستی اور قصبے میں تباہی و بربادی کے آثار دکھائی دیتے، انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ عمارتوں کو بھی جلا کر راکھ کر دیا جاتا، بنگال میں موجود مغربی پاکستانیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے جس گھر، قصبے کی طرف سے مزاحمت کی جاتی اُسے جلا دیا جاتا، غرضیکہ ہر طرف نفرت کی آگ جل رہی حق اور انسانی برداشت کے ناقابل یقین واقعات دیکھنے کو مل رہے تھے۔

ج۔ جنسی استحصال:

اللہ تعالٰی نے مرد اور عورت دونوں کے حقوق مقرر کیے ہیں اور دونوں کا ایک مقام متعین کیا ہے لیکن آج کے اس ترقی یافتہ دور میں عورت ہر طرح سے استحصال کا شکار ہے۔یوں تو پوری دنیا میں عورتیں استحصال کا شکار ہیں لیکن پاکستان میں استحصال کی شدت زیادہ ہے۔ عورت اگر گھر میں ہے تو قریبی رشتہ دار کے ہاتھوں جنسی استحصال کا نشانہ بن رہے ہے اور اگر مجبوری کے تحت گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو ہر طرف سے اسے ہوس زدہ نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جنسی استحصال کے علاوہ بھی عورت کو مختلف مسائل کا سامنا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے بھی مختلف شہروں، دیہاتوں، دفتروں میں عورت خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہے۔ کبھی سسرال کی طرف سے تشدد، شوہر کے ہاتھوں ذلت اور غیرت کے نام پر قتل، جیسے واقعات کا آئے دن سننے، دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اب یہ واقعات معمول کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔

عورت چراغ بن کر بزم کائنات کو روشن کرتی ہے لیکن پھر بھی چراغ کی روشنی سے مستفید ہونے والے ہی چراغ پر وار کر کے اسے بجھا دیتے ہیں۔ عورت ہر دور اور ہر حال میں مرد کا ساتھ دینے کے باوجود بھی طرح طرح کے مسائل اور مصائب سے دوچار ہے اور مرد عورت کا رازداں ہو کر بھی اس کو پامال اور رسوائے زمانہ کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ انسان کے تہذیبی پسِ منظر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو عورت صدیوں سے سماجی ظلم و ستم اور جبر و استحصال کا شکار رہی ہے۔ دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ماں کے بطن سے ہی عورت کے مسائل شروع ہو جاتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں مادہ پرستی کا دور دورہ ہے، انسان اشرف المخلوقات کے درجہ سے گر کر نہایت خود غرض اور مکار بن گیا ہے۔ ان حالات میں ایک عورت میں احساسِ کمتری، عدم تحفظ اور غیر یقینیت کا ایک احساس پیدا ہوا ہے۔ اردو ناولوں میں عورتوں کے مسائل کی عکاسی کے بارے میں صغرا مہدی رقمطراز ہیں۔

> "عورت سے متعلق جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ آج کی عورت کا مسئلہ اس کا تشخص اور اس کی شناخت ہے۔اس کے باوجود کہ قانوناً ان کو ہر طرح کی آزادی ہے۔ مگر ان کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات ہیں کیونکہ قانون اور سوشل ریلیٹی میں

بہت فرق ہے ان مسئلوں کو اردو ناول نگار آج بہت اچھی طرح پیش کر رہے ہیں۔"[۲۶]

ترقی پسند تحریک کے امتیازی اوصاف میں سے ایک وصف اس کی حقیقت نگاری ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے جانہ ہو گا کہ حقیقت نگاری کا فروغ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے اردو میں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ جنسی موضوعات کی حقیقت نگاری جو ترقی پسند تحریک کے دور میں ہوئی۔ کیا اب اس طرح کے ادب کو ترقی پسند تحریک کے مصنّفین اس کو سماجی و معاشرتی اہمیت دیں گے ؟ کیا اب ایسے ادب کو ترقی پسند ادب کہا جائے گا؟ ظاہر ہے فرائڈ کے نظریات سے متاثر ہو کر جو ادب لکھا گیا ہے، اس میں جنسی حقیقت نگاری پائی جاتی ہے اسی طرح ڈی ایچ لارنس سے متاثر ہو کر عصمت اور منٹو نے جو ادب تخلیق کیا وہ مکمل ترقی پسند ادب میں شمار ہونے کے لائق ہے ؟ اسی طرح کے بہت سے سوالات ہیں جو ترقی پسند ادیبوں کو الجھا دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے سر دار جعفری جیسے ترقی پسند ادیب نے منٹو کے افسانوں کو ترقی پسند افسانہ کہنے میں تامل کیا ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

> "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ 'لحاف' اور پھسلن جیسے افسانوں سے سوسائٹی کی جنسی اصلاح نہیں ہو سکتی جنسی تخریب ہوتی ہے، ناتجربہ کار لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اور اس قسم کے افسانوں کا اثر یہی ناتجربہ کار لڑکے اور لڑکیاں لے سکتی ہیں یہ افسانے تخریبی ترغیب کا باعث ہو سکتے ہیں ان کی روح عمل اور غالباً ان کی نیت بھی ترقی پسندی کے مقاصد کے عین خلاف ہے۔ جنسی مضامین میں تفصیلی حقیقت نگاری نہ سائنسی اہمیت رکھتی ہے، نہ ادبی نہ ادبی جنس کی تفصیلی حقیقت نگاری کا مقصد محض شہوانی ہو سکتا ہے شہوانیت کا تجاوز قوم کے قوائے عمل پر برا اثر کرتا ہے اوّل ہی رکاوٹوں اور پابندیوں کی وجہ سے ہندوستان میں جنسی رجحان ضرورت سے زیادہ ہے شہوانی ادب سے یہ رجحان اور زیادہ پستی، اور زیادہ رجعت کی طرف مائل ہو جاتا ہے"۔[۲۷]

بچوں کے جنسی استحصال کی مذمت ہر مہذب معاشرہ کرتا ہے اور ہر کوئی اس استحصال کے خلاف بولنے کو تیار ہے۔ اس گھناؤنے جرم سے نفرت کے باوجود، اب بھی لاکھوں بچے جنسی استحصال کا شکار ہو رہے ہیں جس سے ان کی پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے والدین اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ بھی اس جرم کے خلاف کوئی مضبوط قدم نہیں اٹھاتا یا کوئی اقدامات کیے بھی جا رہے ہیں تو وہ ناکافی ہیں اور ایسے واقعات

میں کمی لانے میں ناکام ہیں۔ جو بچے اس زیادتی کا شکار ہوتے ہیں ان کے لیے کسی کو اس بارے میں بتانا مشکل مرحلہ ہوتا ہے اگر وہ کسی کو اس متعلق بتانا چاہیں بھی تو ان کی بات کو یا تو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا بات سنی ان سنی کر دی جاتی ہے۔ یا پتہ چلنے پر بدنامی کے ڈر سے پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اکثریت ایسی بات بتانے سے قاصر رہتے ہیں اور مسلسل جسمانی زیادتی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی بچوں کے جنسی استحصال کے واقعات میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر سال ہزاروں بچے اس ظلم کا شکار ہوتے ہیں اور پھر تمام عمر اس ناکردہ گناہ کی سزا بھگتتے رہتے ہیں، جنسی استحصال کے بعد بچے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی زبان کسی کے سامنے نہیں کھول پاتے اور اگر کوئی بچہ ہمت کر کے والدین کو بتا بھی دے تو والدین معاشرے کے ڈر سے اس زیادتی پر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح بیشتر کیسز رجسٹرڈ نہیں ہو پاتے اور جو ہو جائیں ان کا بروقت فیصلہ نہیں ہوتا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان کیسز میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے جن کی عمر نو سے گیارہ سال تک ہے۔ اب انفرادی واقعات کے بعد اجتماعی واقعات بھی بڑھتے جا رہے ہیں جو انتہائی پریشان کن صورتحال ہے۔ قصور میں ایک گروہ پکڑا گیا جو کہ تقریباً ار سو بچوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بنا چکا تھا اور ان کی ویڈیوز بنا کر بلیک میل کرتا تھا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو بچے جنسی استحصال کا شکار ہو کر اس کا ذکر کسی سے نہیں کر پاتے وہ ذہنی و نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتے ہیں اور مجرم ان کا رشتہ دار ہو تو ان کے دل سے رشتوں کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔ مزاج میں چڑچڑا پن شامل ہو جاتا ہے اور والدین ان کے مزاج کو سمجھنے کی بجائے ڈانٹ کر سدھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے بچے مزید نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہتے ہیں۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ یہی بچے بڑے ہو کر اسی جرم کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں جو بچپن میں ان کے ساتھ ہوا تھا۔ بھارتی سروے میں ۷۶ فیصد لوگوں نے کہا کہ بچپن میں ان کا جنسی استحصال کیا گیا۔

خالد فتح محمد نے ناول "خلیج" میں جنگی حالات میں ہونے والی انسانی تذلیل اور استحصال کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے، اسی طرح ایک اور جنگی المیہ اور انسانی استحصال کا ایک پہلو بھی دکھایا ہے، جنگ میں اس المیے کا پہلا شکار عورت ہی ہوتی ہے۔ ہر فاتح اپنی مظلوم قوم کی عورتوں کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور یہاں عورت بلا تفریق استحصال کا شکار ہوتی ہے۔ دشمن کے ہاتھوں برباد ہونے کے ہاتھوں بھی جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہے۔

مشرقی پاکستان کے المیے میں بھی جنسی استحصال کے ایسے ہے واقعات پیش آئے، جن کا ذکر تقسیم بنگال پر لکھی گئی تاریخ کی کتب کے ساتھ ساتھ اُردو ناولوں میں بھی ملتا ہے۔ ناول "خلیج" میں بھی ان واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔ ناول میں بنگالی خاتون یاسمین کا کردار ہے جو مغربی فوجی امین الدین (جس نے مکتی باہنی سے گٹھ جوڑ کر لیا) کی بہن ہے۔ یاسمین باپ کے ساتھ اپنے گھر میں بھی غیر محفوظ ہے، باپ کا کئی کئی دن تک کوئی اتا پتا نہیں معلوم ہوتا، ایسے میں دو مغربی فوجیوں نے اس کے گھر گھس کر اسے جنسی ہوس کا نشانہ بنایا، اور اس کے ساتھ وہ بنگالی مرشد علی کے ہاتھوں بھی اپنی عزت لُٹا بیٹھی۔ عورت کے اس استحصال کے متعلق میاں شاہد عمران لکھتے ہیں:

"یہاں عورت صرف عورت کے روپ میں ہے، جس کا کوئی ملک ہے نہ ملت، وہ صرف عورت ہے اور مرد کے ظلم کا شکار ہے۔"[۲۸]

یاسمین نے بھائی کی غداری کی سزا اپنی عزت لٹا کر کاٹی، دونوں فوجیوں نے تفتیش کے دوران بتایا کہ یہ عورت آتے جاتے ہمیں حقارت سے دیکھتی جیسے ہمارا مذاق اُڑا رہی ہو اور اس کا بھائی بھی مغربی فوج سے بغاوت کر کے مکتی باہنی کے لیے کام کر رہا ہے، ہمیں لگتا ہے کہ پلاٹون پر ہونے والے حملوں میں بھی اس کا ہاتھ ہے، اس لیے ہم نے حساب برابر کرنے کا سوچا۔ دونوں فوجیوں کی گفتگو سُن کر افضل کو بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ اس کی دماغی حالت بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

"اُسے یہ عورت ایک سستی اور بے وُقعت جِنس لگی جو اپنے بھائی کی غدّاری کی ذِمہ دار ہے اور اس کی سزا اگر دن اٹھا کر مقبول کرتی ہے۔ شاید بھائی کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ اس کے جُرم کی سزا اپنے جسم اور سوچ پر سہتی رہی ہے"۔[۲۹]

یاسمین دو فوجیوں کے ہاتھوں جنسی ہوس کا نشانہ بنی وہ اپنے ہی معاشرے اور گھر میں غیر محفوظ زندگی جی رہی ہے۔ بھائی اور ماں فرار ہیں، باپ کی اپنی مصروفیات ہیں، وہ بھی ایک طرح جلاوطن کی زندگی گزار رہا ہے اور خود یاسمین جنسی تشدّد کا شکار ہو چکی ہے۔ مغربی فوجیوں کے ہاتھوں لُٹنے کے بعد بنگالی مرشد علی اُسے افضل کے پاس لایا تاکہ یاسمین کو انصاف ملے۔ لیکن آنے والے دنوں میں مرشد علی نے رہزن بن کر اس کی عزت و عصمت پر ڈاکہ ڈالا۔ ایک دن افضل کے یاسمین کے ہاں جانے پر یاسمین افسردہ تھی اور افضل کو دیکھتے ہی باآواز بلند رونے لگی، افضل کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ باپ کی کچھ خبر نہیں اور رات دیر سے مرشد علی آیا اور اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔

یوں یاسمین ایک بار پھر ہی معاشرے اپنے ہی ملک میں بے آبرو ہو گئی، بہت ہی کم وقت میں وہ دو بار جنسی تشدّد کا شکار ہوئی، پہلی بار مغربی فوجیوں کے ہاتھوں اور دوسری مرتبہ مشرقی دلال نے اُسے بے آبرو کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی آنکھوں میں اُداسی رہتی اور ہونٹوں کے کونے کھنچاؤ کا شکار ہنے لگے۔ اس تمام صورتحال کے پیش نظر افضل نے مرشد علی کو سزا دینے اور یاسمین کو اپنے ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا۔ اپنی عصمت لُٹ جانے کے خوف سے وہاں کی عورتیں جس طرح پریشان رہتیں اس کا تذکرہ ناول میں کیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار افضل پیر گنج کے لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کے گھروں میں جاتا، مردوں کی غیر موجودگی میں عورتوں سے بات چیت کی کوشش کرتا، آغاز میں عورتیں اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتیں اور چیختی ہوئی گھروں سے بھاگ جاتیں۔ عورتوں کی یہ خوفزدہ حالت ظاہر کرتی ک اُس سے پہلے وہ فوج کے لوگوں کے ہاتھوں جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ جلتے چولہوں اور روتے بچوں کی پرواہ کیے بغیر وہ گھروں سے بھاگ نکلتی۔ عورتوں کی اس حالت کے بارے میں ناول میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

"افضل کا خیال تھا، عورتوں کے دل میں خوف بیٹھ چکا ہے کہ فوجی اُن کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں، اس لیے وہ اپنی عزت بچانے کے لیے جھولنے میں پڑے بچے کو بھی چھوڑ جاتی ہیں"۔ (۳۰)

افضل ان کے ڈر کو ختم کرنے اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کے گندے بچوں کو اٹھاتا۔ افضل کی یہ ایک ایسی کوشش تھی جس سے وہ ان کے ساتھ ہوئی زیادتیوں کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ مغربی خاتون کے جنسی استحصال کے واقعات کے ساتھ ساتھ مقامی فوجیوں اور ان کے خاندان کی صورتحال ناول میں دکھائی گئی ہے۔ وہ گھروں میں قیدیوں جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کی عورتوں کو جنسی تشدّد کا نشانہ بنایا جاتا، اور یہ سب افسران کی رضامندی سے ہو رہا تھا، افضل کے اعتراض پر اُس کے ساتھی غفار کا کہنا تھا کہ یہ سب تو ہونا تھا اگر مشرقی پاکستان کی فوج ہم پر قابض ہوتی تو ہماری عورتوں کا بھی ایسے ہی جنسی استحصال ہونا تھا۔

بغاوت ہوئی تو مغربی عورتوں کے ساتھ بھی یہی سب ہوا، عورتوں کو جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا، وہی لوگ جو ایک دوسرے کو عزیزوں کی طرح چاہتے تھے اب ایک دوسرے کو بے آبرو کر رہے تھے، افضل نے سوچا کہ وہ یہ سب اپنے علاقے میں ہونے دیتا، وہ کسی بھی گھر کو چکلہ بنانے کی اجازت دیتا، یہاں تو ہر کوئی ایک دوسرے کی عزت پر ہاتھ ڈال رہا تھا اور اپنے اس کام پر شرمندہ ہونے کی بجائے شادمان تھے، یہ سب وہ اپنا حق

سمجھتے تھے، عورت کے اس طرح بے آبرو ہونے پر وہ افسوس کرتا اور اسے عورت سے اس قسم کے رشتے پر کراہت احساس ہوتا۔ ناول میں اس کے عورت کے متعلق خیالات ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں:

"وہ کائنات کی حتمی تسلی اور سکون کا باعث ہونے کا باوجود ایک مخصوص قسم کے استحصال کا شکار اور مشرقی پاکستان میں اس کی زد پر تھی۔"(۳۱)

یہاں عورت کو عیاشی کا ایک ذریعہ سمجھ کر استعمال کیا جارہا تھا، وہ بدلے کی علامت تھی، جس کے جسم کو استعمال کر کے وہ اپنی فتح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ عورت ہر خطے اور ہر قوم میں مظلوم تھی چاہے وہ یونان و روم ہو یا مصر و عراق۔ چین ہو یا عرب ہر جگہ اس پر ظلم ہو رہا تھا۔ بازاروں اور میلوں میں اس کی سر عام خرید و فروخت کی جاتی تھی اور حیوانوں سے بدتر اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ عرب میں لڑکیوں کو زندہ در گور کرنا اور ہندوستان میں ستی کرنا یہ ایسے اعمال تھے جو عورتوں کے حقوق اور مراعات کے منکر تھے۔ اس طرح دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں عورت کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی، اس کے سیاسی اور معاشی حقوق نہیں تھے۔ کہیں کہیں پر بالا دستی قائم بھی ہوئی مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور مسلسل اس کے حقوق پر دست درازیاں جاری رہیں۔ مگر جمہوری عہد میں عورت کی حیثیت یکسر بدل گئی۔ اس کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہو گئیں جو اس سے قبل اس کے لیے خواب سے تھے۔

i۔ جسمانی زیادتی:

انسان شرم وحیا کا پیکر ہے۔ ہر مذہب میں شرم وحیا کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہر غیر فطری اور بے شرمی کے عوامل سے روکا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مرد و زن ایک سے زیادہ کے ساتھ جنسی ربط کے فطری طور پر خواہش رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام سماج اس کے لیے مختلف ضوابط تشکیل دیتے آئے ہیں۔ قدیم مذاہب میں جنس کے ساتھ گناہ کا کوئی تصور نہیں تھا بلکہ جنسی اختلاط کو مقدس رسم کے طور پر مندروں میں ادا کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انسان سب سے زیادہ فطری قوتوں کے ساتھ مقابلے میں ماورائی قوتوں کو مدد حاصل کر سکے۔ اپنی یقینی بارآوری اور ان پودوں اور حیوانوں کی یقینی افزائش انسان کی سب سے بڑی پریشانی تھی جو اس کے لیے خوراک مہیا کرتے تھے، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں خوراک کی فراہمی غیر یقینی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں جنسی افعال اور پوجا پاٹ آپس میں غلط ملط ہو گئے تا کہ جنسی یعنی تخلیقی فعل میں خدائی قوتوں کو شامل کر کے اپنی بقا کو یقینی بنایا جاسکے۔

جنسی زیادتی اور استحصال سیاق وسباق دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ارشد محمود اپنی کتاب "سماجی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ میں لکھتے ہیں:

"سماجی سطح پر کون سا فعل جنس قرار پائے گا، اس کا انحصار اس فعل کے سیاق وسباق کو دیکھ کر طے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بوسہ غیر جنسی محبت، احترام اور سماجی سلام ودعا کی علامت بھی ہو سکتا ہے۔"(۳۲)

خالد فتح محمد نے اپنے اس ناول میں جنسی استحصال کی کئی صورتیں دکھائی ہیں۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح نفرت کی آگ ہر ایک کے دل میں جل رہی ہے اور موقع ملتے ہی وہ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بے گناہ انسانوں کو ظلم و تشدد کر کے قتل کرتے۔ ناول میں ایسے واقعات دکھائے گئے ہیں جن لوگوں کو جسمانی تشدد کر کے بے دردی سے قتل کیا گیا۔ مغربی فوجی کرنل بشیر کی بیوی کے ساتھ ایسا ہی ہوا ان کو جسمانی اذیت دے کر قتل کیا گیا ان کے بازو اور ٹانگیں تن سے جدا کر دی گئیں ایسے ایسے واقعات پیش آئے جو انسان کے غیر مہذب ہونے کی گواہی تھے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ناول نگار لکھتے ہیں:

"عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا، مردہ جسموں میں جھنڈے گاڑ کر آزادی کا جشن منایا گیا۔"(۳۳)

اس سے وحشیانہ کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ مرے ہوئے لوگوں کو بھی اذیت دی گئی اور فتح کے جشن منائے گئے۔ لوگوں کو محفوظ مقام لے جانے کا جھانسہ دے کر بے دردی سے قتل کیا گیا۔ گاؤں نذر آتش کیے گئے۔ ایسے بہت سے انسانیت سوز واقعات ناول میں دکھائے گئے ہیں۔

ناول نگار نے ناول میں افضل کی سوچ اور نظر کے زاویے سے انسانی استحصال کی بہت سی اقسام کی عکاسی کی ہے۔ افضل کی آنکھ سے بستیاں اجڑتی دکھائی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے بنگالی مر رہے ہیں، مشرقی اور مغربی عورتوں کا استحصال ہو رہا ہے، بغاوت، نفرت اور بدلے کی آگ ہر طرف تباہی و بربادی پھیلا رہی ہے۔ اس تمام صورتحال کے متعلق افضل کی سوچ کو ناول نگار نے سب عمدہ انداز میں بیان کیا ہے۔

"وہ انسانوں کے ایک جنگل میں تھا جہاں ہر طرف خوف کی دُھند چھائی ہوئی تھی، اس خوف پر قابو پانے کے لیے انسان ایک دوسرے کو مار رہے تھے اور جیسے جیسے اس خوف کی جڑیں گہری ہوتیں قتل وغارت میں اضافہ ہوتا جاتا"۔(۳۴)

یہی نفرت تھی جو بڑھتی گئی اور بات ایک ملک کے دو حصوں میں تقسیم ہونے تک جا پہنچی اور اس تقسیم سے مزید نفرت کی آگ بڑھی اور انسانیت کی تذلیل اور استحصال کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔

د۔ سیاسی استحصال:

اکیسویں صدی میں جتنا بھی ادب (بالخصوص ناول) سامنے آیا ان میں سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل، ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورتحال کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں سیاستدانوں کی سیاسی چالوں، اقتدار کی ہوس اور لالچ کو عمدگی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔

پاکستان کی عوام اور اس کی سیاست پر نگاہ ڈالی جائے تو پاکستان کے قیام سے اب تک پاکستان کی سیاست پر بھی موروثی رنگ غالب نظر آتا ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقے وقتاً فوقتاً بر سر اقتدار آکر عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کی سات دہائیاں گزر جانے کے باوجود اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سیاسی قیادت عوام کو جمہوری ثمرات نہیں دے سکی۔ بر سر اقتدار طبقے کی ذمہ داری ہے کہ ووٹ لینے کے لیے کیے گئے وعدوں کو پورا کرے لیکن حکومت میں آنے کے بعد صورتحال ہمیشہ اس کے برعکس ہی ہوتی ہے۔

سیاستدان ہمیشہ سے نعروں، وعدوں اور اعلانات کے ذریعے عوام کے بنیادی حقوق غصب کرتے آئے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ اس بات کی گواہ ہے بنیادی حقوق، وسائل اور اختیارات کے ذریعے ہمیشہ ملکی اشرافیہ کو ہی خوش کیا گیا ہے اور عام انسان مسلسل مسائل کی طرف جا رہا ہے۔ عوام کا سب سے بڑا سیاسی استحصال یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کو سیاسی شعور سے آگاہی دینے کی بجائے ان کے اندر غلامانہ سوچ پیدا کی جا رہی ہے۔ ملک کی کسی بھی سیاسی جماعت کے تنظیمی نظام کو دیکھا جائے تو کوئی بھی جماعت ایسی نہیں ہے جو عوام کے اندر سیاسی شعور کی بیداری کے لیے عمل کرتی دکھائی دے۔

ناول "خلیج" میں بھی خالد فتح محمد نے جہاں انسانی استحصال کے مختلف پہلو دکھائے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی صورتحال کے ذریعے بتایا ہے کہ کس طرح سیاستدان، بر سر اقتدار طبقہ عوام کو سیاسی صورتحال بے بہرہ رکھ کر ان کا سیاسی استحصال کرتا ہے۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ایک جرّات مندانہ قدم اٹھایا اور اپنے کرداروں کے ذریعے معاشرے کے نام بہاد معزز، شریفوں کو بے نقاب کیا ہے جو ہر طرح سے بے بس و مجبور عوام کا استحصال کرتے ہیں اور خود کو ان کا خیر خواہ ظاہر کرتے ہیں۔

ناول "خلیج" میں بر سر اقتدار طبقے کو نشانہ بنایا گیا ہے کہ جن کی نااہلی سے ملک دو حصوں میں بٹ گیا اور اس تمام دورانیے میں دونوں طرف کی عوام کو جبر و استحصال کا نشانہ بنایا گیا۔ جبر کا شکار ہونے والی عوام پر ایک

وقت آیا کہ بغاوت کا بھوت سوار ہوا اور نتیجتاً عوام اور فوج ایک دوسرے کے مدمقابل ہو گئے۔ "سقوطِ ڈھاکہ" کے موقع پر بھی انسانی استحصال کی کئی شکلیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صفدر محمود اپنی کتاب "پاکستان کیوں ٹوٹا؟" میں لکھتے ہیں:

"ہڑتال کے لیے مجیب الرحمٰن کی اپیل کے فوراً بعد عوامی لیگ کے انتہا پسند کارکن ڈھاکہ کے مختلف حصوں میں پھیل گئے، جہاں انھوں نے لوٹ مار، آتشزدگی اور غنڈہ گردی کا بازار گرم کر دیا۔ سرکاری ملازمتوں کو پستول دکھا کر عوامی لیگ کی قیادت کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ نسلی آویزش کو ہوا دینے کے لیے غیر بنگالیوں کے گھروں پر سرخ نشان لگا دیے گئے اور ان پر حملے کیے گئے۔ صوبہ بھر میں سرکاری دفاتر پر حملے کیے گئے اور قومی پرچم کی بے حرمتی کی گئی اور اسے نذرآتش کیا گیا۔ ڈھاکہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بنگلہ دیش کا ترانہ نشر کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پورا صوبہ خوف اور دہشت گردی کی گرفت میں تھا"۔ (۳۵)

ادب پر سقوط ڈھاکہ کے اثرات شدت کے ساتھ آخری دنوں میں رونما ہونا شروع ہوئے اور اپنی اصل شکل میں ملک کے دولخت ہونے کے بعد سامنے آئے، ایسا کیوں ہوا؟ یہ سب کچھ ملک کی مجموعی صورت حال کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے۔ اسی قسم کے حالات کی عکاسی اردو ناول میں بھی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ جنھوں نے پاکستان بنتے دیکھا، قتل و غارت دیکھی، خون کی ندیاں بہتی دیکھیں، معصوم لوگوں کی عزت و مال کو لوٹا گیا، محبت کے چراغ روشن ہوئے لیکن کچھ مفاد پرستوں نے ان چراغوں کو جلنے سے پہلے نہ صرف بجھا دیا بلکہ نفرتوں میں بدل دیا۔

عوام کو جب حقیقت سے آگاہ نہ کیا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہی بنگال کی عوام کے ساتھ ہوا، برسر اقتدار طبقے نے اپنے مفاد پرستوں کے لیے عوام کے سیاسی حقوق سلب کیے اور ذمہ دار مغربی پاکستان کو ٹھہرایا، جبکہ حقیقت تو یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان کی نااہلی بھی اس تقسیم کا باعث بنی۔ ناول میں مشرقی پاکستان کے برسر اقتدار طبقے کی اس نااہلی کا ذکر کرتے ہوئے خالد فتح محمد لکھتے ہیں:

"اس کے خیال میں بنگالیوں کے ساتھ ناانصافی میں مغربی پاکستان کا اتنا ہاتھ نہیں تھا جتنا ان کے اپنے سیاست دانوں کا تھا جو مشرقی پاکستان کو اپنی کالونی بنا کر رکھنا چاہتے تھے"۔ (۳۶)

اس سانحے نے دانشوروں اورادیبوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

"بیشتر عالمی قوتوں کی ریاکاری، ہمارے تضادات، کوتاہیوں اور غفلتوں نے ہمیں یہ دن دکھایاہے کہ ہم کٹ کر آدھے رہ گئے ہیں۔ ہمارا باوقار چہرہ خراشوں سے اٹ گیا ہے، شکست کے بعد کا قدرتی رد عمل یہ ہوتا ہے کہ شکست خوردہ قوم سناٹے میں آجاتی ہے۔ پاکستانی قوم آج کل اسی سناٹے کے عالم سے گزر رہی ہے۔"(۳۷)

سقوطِ ڈھاکہ کے دوران نوے ہزار قیدی بھارت کی قید میں تھے اور لاکھوں افراد ڈھاکہ کے ریلیف کیمپوں میں موجود تھے جو پاکستان آنا چاہتے تھے جبکہ لاکھوں بہاری پاکستان میں داخل ہو چکے تھے جو پاکستان کی معیشت اور سیاست پر ایک نیا دباؤ تھا اور کئی نئی خرابیاں پیدا کر رہا تھا۔ یہ بھی انسانی استحصال کی ایک بڑی مثال ہے۔

i۔ سیاسی کشمکش:

کسی بھی معاشرے، خطے یا ملک میں بیرونی مداخلت حد سے بڑھنے لگے تو اس معاشرے، خطے یا ملک میں اندرونی خلفشار سر اٹھانے لگتی ہے۔ بیرونی طاقتیں اس خلفشار کا فائدہ اٹھاتے ہیں، جس سے ملکی سیاست کشمکش کا شکار ہو جاتے ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام آپس میں یا حکومت کے خلاف بھڑک اٹھتے ہیں، اور اس صورتحال سے ایک غدار اشرافیہ جنم لیتی ہے۔

ناول "خلیج" میں بیرونی مداخلت اور سیاسی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے، افضل اور اس کے ساتھی فوجی غفار کی گفتگو میں بتایا گیا کہ انگریز کی برصغیر میں مداخلت کے وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا، ان کی آمد سے قبل مسلمان اور ہندو ایک اچھی زندگی بسر کر رہے تھے۔ انگریز نے برصغیر میں آتے ہی یہاں کے کلچر، خصوصیات اور عادات کا مطالعہ کیا اور ذات پات کے نظام کے ڈسے ہوئے طبقے کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا اور ایک پالیسی کے تحت معاشرے کو منتشر کر دیا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں کی چال نے نفرت کی ایسی فضا قائم کی جو تقسیم کے وقت ایک بارودی سرنگ کی طرح پھٹی، نتیجتاً مل کر ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کو بے آبرو کرنے لگے۔

ہجرت کرنے والوں پر حملے ہوتے، عزتیں پامال ہوئیں، غرضیکہ ہر طرح سے انسانیت کا استحصال ہوا، یہ کہانی برصغیر کی تھی، اب بنگال کو تقسیم کرنے میں ہندوستان یہ کردار ادا کر رہا تھا۔ ہندوؤں نے بنگالیوں سے بغاوت کروائی جس کے نتیجے میں مغربی پاکستان کے باشندوؤں اور اس کے ساتھ ساتھ بہاریوں کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ بھارتی فوج مکتی باہنی کے شدت پسندوں کو باقاعدہ ٹریننگ دیتی اور ہتھیار فراہم کرتی، ہندوؤں کے پشت

پناہی سے بنگالی بہادری سے پڑتے اور ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے۔ بہاریوں کو بھی اپنے ظلم کا نشانہ بناتے، مکتی باہنی جب چاہے کسی بستی میں گھس کر فوج کے ہمدرد لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ ایسی کاروائیاں کر کے وہ لوگوں کو اپنی طاقت کا احساس دلاتے رہتے۔

معاشرے کا طبقاتی نظام بھی سیاسی کشمکش اور غریب کے استحصال کا سبب بنتا ہے۔ تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان میں بھی طبقاتی نظام موجود تھا۔ جن میں سرمایہ دار، زمیندار اور ہندو معاشرے کے طاقتور طبقے تھے۔ ہر معاشرے میں طاقتور طبقے نچلے طبقوں کا استحصال کرتے ہیں، یہی سب مشرقی بنگال میں ہو رہا تھا، ہندوؤں کی اکثریت تو یہاں سے جاچکی تھی لیکن ان کی جائیدادیں یہاں موجود تھیں، جس کی وجہ سے یہاں ان کا اثر ورسوخ موجود تھا۔ جو فوج کی کوششوں کے باوجود ختم نہ ہو سکا۔

دوسری طرف بہاری اور بنگالی تھے جو سالوں سے ایک دوسرے کی جانوں کے دشمن تھے۔ ان دونوں طبقوں نے کبھی ایک دوسرے کے وجود کو قبول نہ کیا، گول مال بغاوت میں بنگالیوں نے بہاریوں کو جڑ سے ختم کرنے کی ہر کوشش کی۔ جب بہاریوں کو موقع ملتا وہ ظلم کی انتہا کرتے، انہیں فوج کی مدد حاصل تھی، انھوں نے بھی چن چن کر بنگالیوں کو مارا۔ عجیب کشمکش کی صورتحال تھی۔ اپنی برتری کے لیے دونوں طبقے انسانیت کا استحصال کر رہے تھے، مکتی باہنی اس قتل وغارت میں برابر کی شریک تھی۔ وہ فوج کے ہمدرد بنگالی اور بہاریوں کو نشانہ بناتے، ہر کوئی اپنی شناخت قائم رکھنے کے لیے دوسرے کا استحصال کر رہا تھا۔ ناول میں ان طبقوں کی آپس کی کشمکش کو ناول میں یوں بیان کیا گیا ہے۔ خالد فتح محمد لکھتے ہیں:

> "مکتی باہنی ایک نظریے کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی لیے ایک نیا ملک مانگ رہے تھے جبکہ بہاری مشرقی پاکستان میں اپنی بقا اور شناخت کے لیے نئے ملک کو وجود میں آنے سے روکنا چاہتے تھے"۔[۳۸]

ناول نگار نے بہاری کرداروں کی بات چیت کے ذریعے اس طبقے نسلی غرور کو نمایاں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ الگ ملک کے مخالف تھے۔ اس غرور میں انہوں نے ہمیشہ نفرت کے بیج بوئے اور اپنی نسلی بقا کے لئے ہر طرح کا ظلم روا رکھا، دوسری طرف مکتی باہنی کے بل بوتے پر بنگالیوں کے دلوں سے بھی خوف ڈر جاتا رہا، جوں جوں مکتی باہنی کسی علاقے میں طاقتور ہوتی وہاں کے مقامی دلیر ہو جاتے اور فوج سے آنکھیں ملاتے ہوئے کسی خوف کے بغیر ان کے پاس سے گزرتے ان کی آنکھیں پیغام دیتی کہ اب ہمارا وقت آچکا اپنی خیر مناؤ اور جہاں فوج طاقتور ہوتی ان آنکھیں دکھانے والوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا۔ یوں فوج بنگالیوں، مکتی باہنی اور

بہادروں کی آپس کی کشمکش نے بہت سی انسانی جانوں کا نقصان کیا، بالآخر ملک ہی دو ٹکڑے ہو گیا۔ آپس کی کشمکش چپقلش نے انسانیت کا استحصال کیا۔

ناول کے چیدہ چیدہ واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ ناول "خلیج" میں مصنف نے جنگ کے دوران ہونے والے انسانیت کے استحصال کی ہر صورت کی عکاسی کی ہے۔ جنگ ایک ایسا المیہ ہے جس کی زد میں معاشرے ہر فرد آتا ہے۔ ناول میں ان افراد (بچے، عورت، مرد) کے ہوئے استحصال کو بخوبی تجزیہ کیا گیا ہے۔ سماجی صورتحال، علاقوں کی تباہی، انسانیت کی تذلیل، غرض کہ ہر پہلو کو ناول میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ سیاسی کشمکش اوراس سے عوام پر گزرنے والی کرب ناک قیامت کا تذکرہ بھی موجود ہے، مشرقی اور مغربی عوام پر گزرنے کرب ناک لمحات اور اس کے ساتھ ساتھ فوجیوں کی گھر سے دوری نفسیاتی الجھنوں کو بھی ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ فوجیوں کی گھر سے دوری اور ان کی نفسیاتی صورتحال کو کمال خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

المختصر یہ کہ مصنف نے کامیابی سے اپنے پڑھنے والوں کہ یہ بات باور کرائی ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے متعلق عام فرد اور فوجی کی سوچ کیا ہے۔ اس سے متعلق دونوں طرف کی عوام کی سوچ کیا ہے۔ اس ناول کا سب سے اہم نقطہ جو ناول نگار نے واضح کیا ہے کہ اقتدار کی ہوس کس طرح انسانیت کی تذلیل کا ذریعہ بنتی ہے۔ بیرونی اور اندرونی سازشوں، غلطیوں کا نتیجہ کس قدر بھیانگ ہوتا ہے جس میں انسانیت کی تذلیل اور انسانی زندگیوں کے زیاں کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

پاکستان کے معاصر ادبی منظر نامہ پر نظر دوڑائیں تو بڑے بڑے ناول نگاروں کی صف میں ایک معتبر نام خالد فتح محمد کا ہے۔ ان کا زیرِ بحث ناول سقوطِ ڈھاکہ کے بارے میں لکھا گیا ہے اس سے پہلے بھی سقوطِ ڈھاکہ پر کافی ناول موجود ہیں جن میں صدیق سالک کا ''میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا'' اور طارق اسماعیل ساگر کا ناول ''کمانڈو'' میرے مطالعہ سے گزرے ہیں۔ لیکن یہ ناول مذکورہ بالا ناولوں سے اس لیے مختلف ہے کہ اس ناول میں دوطرفہ حقائق کو منظر پر لانے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ اول الذکر ناول میں صرف اور صرف پاکستان کا نکتہ نظر سامنے رکھا گیا ہے اور بنگلہ دیشیوں کو ظالم کے روپ میں دکھایا گیا ہے جو کہ کہیں نہ کہیں حقائق سے متصادم ہے۔

خالد فتح محمد کچھ عرصہ خود بھی مشرقی پاکستان میں رہے، اس لیے وہاں کے حالات اور حقائق سے بخوبی واقف تھے، یوں انہوں نے اپنے ناول "خلیج" میں مشرقی پاکستان کے المیے کا سیاسی، سماجی اور فوجی تجزیہ کیا

ہے۔ ناول میں مصنف نے کچھ کرداروں اور واقعات کے ذریعے مختلف موضوعات پیش کیے ہیں۔ اس ناول میں انسانی استحصال کی جو صورتیں سامنے آتی ہیں ان میں سماجی استحصال، جنسی استحصال، اور سیاسی استحصال پیش کیا ہے۔ سیاسی استحصال میں سیاسی کشمکش کو عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے حالات ، ہجرت کے دوران انسانوں کا استحصال وغیرہ اہم موضوعات ہیں۔

حوالہ جات

۱. سعید احمد، ڈاکٹر، "ترقی پسند تحریک کا ادبی و فکری اساس"، مضمون مشمولہ اردو ریسرچ جرنل، نیو دہلی، شمارہ ۶، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۶۵

۲. انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷

۳. احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۴ء، ص ۲۱

۴. عطاالرحمٰن میو، ڈاکٹر محمد وقاص، "میجر (ر) خالد فتح محمد کی ناول نگاری"، مطبوعہ، نورِ تحقیق، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، جلد ۳، شمارہ ۱۱، ص ۲۳۵

۵. زینت افشاں، ڈاکٹر، "اردو ناول اور سانحہ مشرقی پاکستان"، مضمون مشمولہ زبان و ادب (شمارہ ۲۰)، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد،

۶. یونس خان، "مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا ناول "خلیج" از خالد فتح محمد www.humsub.com, dated 11 September, 2021, 1900hrs

۷. اظہر حسین، "خالد فتح محمد کی ناول نگاری"، www.aikrozon.com, dated 11 September, 2021, 1940hrs

۸. خالد فتح محمد، "خلیج"، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴

۹. خالد فتح محمد، "خلیج"، ص ۱۵

۱۰. طاہر رسول، "خالد محمد فتح کا ناول "خلیج"، dated 12September, 2021, 1640hrs، www.humsub,com.pk

۱۱. خالد فتح محمد، "خلیج"، ص ۳۳

۱۲. اظہر حسین، " خالد فتح محمد کی ناول نگاری"، www.aikrozon.com, dated 14 September, 2021, 1700hrs

۱۳. ہنس راج رہبر، "ترقی پسند ادب ایک جائزہ"، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۵

۱۴. علی سردار جعفری، "ترقی پسند ادب"، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۱ء، ص ۸۲

۱۵. خالد فتح محمد، "خلیج"، ص ۷

۱۶. ایضاً، ص ۱۷-۱۶

۱۷. ناول خلیج:ناول نگار خالد فتح محمد (تبصرہ) میاں عمران شاہد
www.ilmoadabpublisher.com, dated 18 September, 2021, 2040hrs

۱۸. خالد فتح محمد، "خلیج"، ص۱۱۷

۱۹. ناول خلیج:ناول نگار خالد فتح محمد (تبصرہ) میاں عمران

۲۰. ایضاً، ص۹

۲۱. خالد فتح محمد، "خلیج"، ص۱۰۱،۱۰۰

۲۲. ایضاً، ص۱۰۸

۲۳. ایضاً، ص۱۸

۲۴. ایضاً، ص۲۰

۲۵. ایضاً، ص۱۰۰

۲۶. صغرا مہدی، "اردوناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت"، سجاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۰۲ء،، ص۱۴۳

۲۷. عزیز احمد، "ترقی پسند ادب"، چمن بک ڈپو اردو بازار، دہلی، سن ندارد، ص۲۷-۲۸

۲۸. ناول خلیج:ناول نگار خالد فتح محمد، تبصرہ، میاں عمران شاہدwww.ilmoadabpublisher.com
۱۲فروری۲۰۲۱ء،PM ۷:۹

۲۹. ایضاً، ص۴۷

۳۰. ایضاً، ص۸۹

۳۱. ایضاً

۳۲. ارشد محمود، "سماجی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ"، سٹی پریس بک شاپ، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص۹۰

۳۳. خالد فتح محمد، "خلیج"، ص۱۱۷

۳۴. ایضاً

۳۵. صفدر محمود، ڈاکٹر، "پاکستان کیوں ٹوٹا"، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۵۵

۳۶. ایضاً، ص۱۰۰

۳۷. احمد ندیم قاسمی، "ماہنامہ فنون" لاہور، دسمبر ۱۹۷۱ء، ص۳

ایضاً، ص۸۹

باب سوم:

ناول "زینہ" میں انسانی استحصال کا تجزیہ

لفظ استحصال کا مفہوم یہ ہے کہ حصہ داری کے کام میں کسی دوسرے کا حصہ ہتھیانا، فائدہ حاصل کرنا، ناجائز فائدہ اٹھاناوغیرہ ہیں۔ اس کے لیے جھپٹ، چھین، خود مطلبی، طلب اور حصول وغیرہ کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور سے آج تک انسانی استحصال کا بنیاد کسی بھی معاشرے میں پیدا ہونے والی معاشی ناہمواریاں رہیں۔ جب دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہوئی اور بورژوا کے پاس دولت اور پرولتاریہ کے حصے میں صرف مزدوری آئی تو معاشرے میں ایک طبقہ غریب سے غریب تر اور امیر سے امیر تر ہوتا چلا گیا۔ انسان نے اپنی لالچ کے زیر اثر آکر انسان کی پہچان کرنا چھوڑدی وہ زندگی کے اس دور میں واپس چلا گیا جہاں سے معاشرتی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی۔ ڈاکٹر عطاالرحمن رقمطراز ہیں:

> "وہ نہ صرف اس زبوں حالی اور اس کے ذمہ داران کے بارے میں آگاہ ہوتے بلکہ ان مسائل سے چھٹکارہ پانے کی خواہش بھی اس کے اندر سلگنے لگتی ہے۔یہی وہ تحریک ہے جو قارئین کو سعی وجہد کی راہ سجھاتی ہے۔"[۱]

معاشی ناہمواریوں کی بدولت معاشرے میں ذہنی، جسمانی، سماجی اور معاشی استحصال کی صورتیں سامنے آئیں۔ ادب کی ابتدا سے ہی استحصال کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ ادب میں استحصال کی ابتدائی حالتوں کے بارے میں نگہت نورین اور فوزیہ اسلم اپنے مضمون "اجیت کور کے ناول "گوری" میں سماجی استحصال کا مطالعہ" میں لکھتی ہیں:

> "ابتدائی دور میں انسانی سماجوں میں اجتماعیت اور اشتراکیت کا عنصر غالب رہا اور غالباً یہی انسانی زندگی کی بقا کا ضامن بھی تھا۔ سماج اپنے خاص ارتقائی سفر کے مختلف ادوار میں متعدد نظاموں سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا۔ ان نظاموں میں غلام داری، جاگیر داری اور سرمایہ داری اور جاگیر داری نظام کا دور رائج ہوا تو معاشرے اور فرد کے مابین تعلقات معاشی بنیادوں پر بدلنے شروع ہو گئے۔ اس طرح پیداوار اور اس کے ذرائع پر قبضے کی بنا پر فیصلہ سازی کا عمل شروع ہوا۔ جو انسانی استحصال کی بنیاد بنا۔ یہاں سے انسانوں کا استحصال انسانوں ہی کے ذریعے شروع ہوا"۔[۲]

دنیا میں اگر کہیں معاشی ظلم اور ناانصافی نظر آتی ہے تو وہ وسائل معاش میں کمی کے باعث نہیں بلکہ ان وسائل کی غلط اور غیر منصفانہ تقسیم کی وہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے راہ ہدایت کا سرچشمہ حضرت محمد ﷺ کو بنایا اور قانون کے لئے اپنی آخری کتاب قرآن کریم نازل فرمائی۔ اسلام دین فطرت ہے اور اس میں انسان کو ہر مضر شے سے منع کیا گیا ہے۔ معیشت جو کہ انسانی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے اس کے بارے میں دین اسلام کے اندر مکمل راہنمائی موجود ہے تاکہ عوام الناس کے اندر وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کو روکا جاسکے۔

ہمیشہ سے معاشرے میں طاقتور قوتیں کمزوروں کا استحصال کرتی آئی ہیں۔ کمزور طاقتور کے ہاتھوں مسلے جارہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں قرارداد منظور ہوئی جس میں پوری دنیا میں رہنے والے انسانوں کے بنیادی حقوق کا تعین کیا گیا اور ان حقوق کی فراہمی کو یقینی بنانے پر زور دیا گیا۔ اس قرار داد کے منظور ہو جانے کے باوجود صورتحال کچھ بہتر نہیں ہے۔ معاشرے کے ہر فرد کو برابر کے حقوق نہیں حاصل۔ طاقتور افراد قانون توڑتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کو پکڑ نہیں کی جارہی اس کے برعکس کمزور شخص ہر وقت قانون کی زد میں رہتا ہے۔ عالمی سطح سے قطع نظر اگر بات صرف اپنے پاکستانی معاشرے کی بھی ہو تو بھی صورتحال انتہائی خطرناک ہے۔ عماد ظفر لکھتے ہیں:

> "جبری گمشدگیوں کا دائرہ کار بھی پاکستان بھر میں پھیل گیا۔ صحافیوں پر نامعلوم افراد کی جانب سے حملوں میں اضافہ ہوا۔ کئی شہروں میں توہین مذہب کو بنیاد بنا کر امن و امان کے مسائل پیدا کیے گئے۔ اقلیتوں کا معاشی و سماجی استحصال جاری رہا"۔ (۳)

غیرت کے نام پر عورت کو قتل کیا جارہا ہے جبکہ مرد گھناؤنے سے گھناؤنا جرم کرکے بھی آزادی سے زندہ ہے۔ غیرت کے نام پر عورت کو قتل کرکے یا اس پر دیگر پابندیاں عائد کرکے اس کا استحصال زور پکڑتا جا رہا ہے اور اس کو روکنے والا کوئی نہیں۔

اسی طرح معاشرے میں ایسے افراد بھی ہیں جن کو کھانے کے لیے خوراک نہیں مل رہی اور کچھ افراد ایسے ہیں جو اپنے کتوں کے لیے بھی عمدہ سے عمدہ خوراک تیار کرتے ہیں۔ معاشرے کی یہ پریشان کن صورتحال یہیں پر ختم نہیں ہوتی، اس کی زد میں بچے بھی آرہے ہیں، ایک سروے کے مطابق مکمل خوراک نہ ملنے پر ۴۴ فیصد بچے اپنی عمر کے مطابق صحت مند نشوونما نہیں کر پارہے۔ خواتین، اقلیتیں، خواجہ سرا یہ سب ایسے افراد ہیں جن کو معاشرے میں مکمل حقوق فراہم نہیں کیے جاتے، معاشرے کے طاقتور گروہ ان کی حق

تلفی کرتے ہیں۔ سڑکوں پر بھیک مانگتے بچے، خواجہ سرا، خواتین اس استحصال کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ کیونکہ جب ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتی تو وہ اس طرح کے کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ایک مشہور قول ہے کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے، لیکن دنیا کے قریباً سب ہی معاشرے اس قول کی نفی کر رہے ہیں۔

اردو ناول میں بھی استحصالی صورتیں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر فتح محمد کے ناول "زینہ" میں بھی استحصال کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ خالد فتح محمد کا ناول "زینہ "۲۰۱۹ء میں شائع ہوا۔ یہ ان کا آٹھواں ناول ہے۔ "زینہ" ان کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اس ناول میں "حال" کو موضوع بنا کر کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ اپنے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی روزمرہ زندگی سے جُڑے مسائل اور ان مسائل کے محرکات تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ بیانیہ انداز میں لکھا گیا یہ ناول زندگی کے بہت سے مسائل اور پوشیدہ چیزوں کو سامنے لاتا ہے۔

الف۔ ناول "زینہ" کا فکری تجزیہ

زمانہ قدیم میں ادب کو صرف دل بہلانے اور وقت کو خوشگوار بنانے کی چیز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں انسان نے معاشرے کی شکل میں اکٹھا رہنا شروع کیا تو بہت سے مسائل پیدا ہونے لگے۔ ایسے میں جس چیز کو انسان نے مسائل کی عکاسی کے لیے چنا وہ ادب ہی ہے۔ اس طرح آج کا ادب صرف دل بہلانے کی چیز نہیں رہا، بلکہ ادب اور زندگی جزو لانیفک بن چکے ہیں۔ ادب اب ادب برائے ادب کے میدان سے نکل کر ادب برائے زندگی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے، اس تمام سلسلے کے پس منظر میں بہت سی وجوہات رہی ہیں۔ جیسے سائنس نے ترقی کی، نئے حالات پیدا ہوئے، زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں آنے لگیں، نت نئے چیلنج سے انسان کا سامنا ہونے لگا، معاشی حالات بھی بدلنے لگے، ایسے میں ادب کس طرح صرف تفنن وطبع کا سامان بن رہ سکتا تھا۔ تو یوں ادب میں انسانی معاشرے اور اس کے حالات و اقعات کی جھلک نظر آنے لگی۔ محمد سلمان حجام لکھتے ہیں:

> "حیات و کائنات کے ساتھ ساتھ جب لوگوں کی مالی حالت میں سُدھار ہو اور سماج میں تبدیلیاں ہوئیں اور انسان اکثر اوقات روزمرہ کے کاموں میں ہی مصروف رہنے لگا تو طویل داستانیں سُننے اور سُنانے کا وقت انسان کے پاس نہیں رہا۔"[۴]

انسانی استحصال کی ادیبوں نے ادب کی مختلف اصناف کے ذریعے عکاسی کی ہے۔ اور اپنے اپنے انداز میں استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی ہی ایک کوشش ترقی پسند تحریک کی صورت

میں اردو ادب میں واضح دکھائی دیتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں روس کے انقلاب نے پوری دنیا پر جو اثرات مرتب کیے، یہ تحریک انہی اثرات کے تحت شروع ہوئی۔ دوسری طرف ۱۹۲۳ء میں ہٹلر نے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کیا۔ ہٹلر کے اس قدم سے ۱۹۳۵ء میں پیرس میں مغربی ادیبوں کی ایک کانفرنس بلائی گئی جس میں ہندوستان سے سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے شرکت کی۔ اسی کانفرنس سے واپسی پر ان دونوں ہندوستانی ادیبوں نے ہندوستانی طلبہ (جو کے لندن میں اُس وقت مقیم تھے) کے ساتھ مل کر "انجمن ترقی پسند مصنفین" کی بنیاد ڈالی بعد میں یہ "انجمن ترقی پسند تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کے مقاصد میں یہ بات شامل تھی کہ ادب کو رجعت پسندی سے آزاد کرا کے عوام کے قریب لایا جائے، معاشرے میں ہونے والے انسانی استحصال، بھوک، افلاس، سماجی مسائل اور سیاسی غلامی کو ادب کا حصہ بنایا جائے تا کہ معاشرے کا مظلوم طبقہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھا سکے۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> "اب زمین اور عام انسان کے جو بھی مسائل تھے وہ ترقی پسند کے مسائل تھے۔ معاملہ جنگ کا ہو یا ظلم کا۔ انقلاب کا ہو یا احتجاج کا۔ کلرک کا ہو یا چپڑاسی کا۔ مزدور کا یا کسان کا۔ ترقی پسند ادیبوں نے ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا"۔[۵]

سماجی استحصال کی اس بحث کو مکمل کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انسانی حقوق کی فراہمی اور بحالی اس وقت تک ایک خواب ہی ہے جب تک عالمی قوتیں اور طاقتور معاشرے یا گروہ اپنے مفادات سے ہٹ کر انسانی حقوق کے لیے کوشاں نہ ہوں۔ ایک معاشرہ بھی اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ اپنے افراد کو یکساں حقوق کی فراہمی کو یقینی بنائے گا۔ اور ہر ایک فرد کو آزادی سے جینے کا مکمل حق دے گا۔

عورت کی سماجی حیثیت کمزور ہے اس لیے وہ نفسیاتی تشدد کا بھی شکار رہتی ہے۔ ہمارے ہاں نفسیاتی تشدد یا استحصال کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو دینی چاہیے۔ نفسیاتی استحصال میں ہر وہ چیز شامل ہے۔ جس سے کسی کا ذہن خوف، ڈر یا دباؤ کا شکار ہو جائے۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> "ہر وہ عمل جس سے ذہنی اذیت، کوفت پیدا ہو، عورتوں سے بد کلامی، انھیں بے عزت کرنا، صنفی امتیاز، جس سے لڑکیوں کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہو، جنسی جسمانی تشدد، شادی شدہ عورتوں کو جائیداد کے حقوق اور ملکیت سے محروم کرنا۔۔۔ شوہر کی طرف سے نکال دیئے جانے، طلاق، بچے چھین لینے کی دھمکی، عورتوں کو گھروں میں مقید کرنا، عام میل جول پر پابندی، نفسیاتی تشدد کے زمرے میں آتا ہے۔"[۶]

اس نفسیاتی استحصال سے نکلنے یا چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے عورت کو نہ تو سماج اور نہ ہی ریاست کوئی راستہ فراہم کرتی ہے۔ خاوند کی طرف سے نفسیاتی تشدد کو گھریلو معاملہ سمجھ کر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس صورتحال میں لڑکیاں گھروں سے فرار کی راہ اختیار کرتی ہیں اور غلط ہاتھوں میں پھنس جاتی ہیں یا اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہیں۔ خودکشی کے زیادہ واقعات نفسیاتی تشدد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

کسی بھی انسان کا سماجی استحصال یہ ہے کہ معاشرے میں رہتے ہوئے اسے باقی اپنے جیسے انسانوں کے برابر بنیادی حقوق نہ دیئے جائیں۔ انسانی حقوق کے نظریے کے مطابق ہر انسان یکساں طور پر بنیادی حقوق اور ضروریات کا حقدار ہے اور یہ سماج کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہر فرد کو یہ تمام حقوق یکساں طور پر فراہم کرے۔ اگر کوئی فرد ان ضروریات سے محروم رہتا ہے یا اس پر ظلم و زیادتی کر کے اسے جبراً اس کے حقوق سے محروم رکھا جائے تو یہ اس کا سماجی استحصال ہے۔ انصاف پر مبنی معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر فرد کو برابر کے حقوق فراہم کرے۔ اسے جینے کے لیے بنیادی ضروریات زندگی ترجیحی بنیادوں پر فراہم کرے کیونکہ آزادی سے جینا ہر فرد کا بنیادی حق ہے اور اسے یہ حق دلانا معاشرے کی ذمہ داری ہے۔ ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے بے حد ضروری ہے کہ اس میں رہنے والے افراد کو بلا تفریق تعلیم، صحت اور اظہارِ رائے کے مکمل مواقع فراہم کیے جائیں۔ سماج کی طرف سے ان کے ساتھ کسی بھی قسم کا استحصالی رویہ نہ برتا جائے۔

ناول "زینہ" حقیقت نگاری اور ترقی پسند تناظر میں لکھا گیا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے قیام کے بعد اردو ادب بالخصوص فکشن میں حقیقت نگاری کو فروغ ملا اور یوں ترقی پسند تحریک نے ادب کا سماج اور حقیقت سے رشتہ مضبوط کر دیا۔ حقیقت نگاری کی تحریک سے قبل اردو ادب میں رومانی تحریک نے انسان کے نازک ترین احساسات و جذبات کو پوری طرح اپنے لپیٹ میں لے رکھا تھا جس میں سماجی شعور کی کارفرمائی کو ادب کا حصہ بنانے سے احتراز برتا اور شعوری طور پر ایسے ادب کو پذیرائی دی گئی جس میں سماجی حقیقتوں کی بجائے شعر و ادب کی کائنات میں تخیل کی پیداوار کو ترجیح دی جاتی لیکن ترقی پسند تحریک کے ساتھ حقیقت پسندی کو فروغ ملا اس کی بنیاد کارل مارکس اور لینن نظریات پر رکھی گئی۔ شہزاد منظر اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

> "حقیقت نگاری کے رجحان کو فروغ دینے میں انقلابِ روس اور مارکسزم کے اثرات نے بھی بہت کردار ادا کیا۔ اس لیے کہ انقلابِ روس اور مارکسزم نے زندگی

کو دیکھنے میں اور سمجھنے کا نیا زاویہ نظر دیا اور ساتھ ہی سماجی انقلاب اور معاشی مساوات
کے نظریے پر زور دیا۔"(۷)

ادب اور سماج کا براہ راست رشتہ ہوتا ہے جو ادب کو سنوارتا ہے۔ ادب زندگی کے وسیع ترین مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے کسی عہد کی تصویر پیش کرتا ہے اور وہی ادب اپنے اندر تاثیر رکھتا ہے جس میں اس عہد کا سماجی شعور جھلکتا ہو۔ حقیقت سے ماورا مافوق الفطرت عناصر یا خالصتاً تخیل پر مبنی ادب پارہ زیادہ دیر تک قاری پر اثر انداز نہیں رہ سکتا۔ ایسا ادب پارہ محض چند لمحوں کی ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قاری واپس اپنی دنیا میں آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری حقیقی اور انسانیت کی وحدت کا پیگام دینے والے ادب کو ادب کا مظہر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

" صحیح ادب کا معیار یہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثر قبول کر سکیں۔ اس کے لیے دل میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے ہونا چاہیے۔ ہر ایماندار اور صداق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم وملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے۔"(۸)

اردو ناول پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کے فرسودہ ڈھانچے میں تبدیلی آئی۔ ناول نے تصوریت سے نجات دلا کر حقیقت پسندی کا آغاز کیا۔ زندگی میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ادب کو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ طبقاتی شعور بیدار کر کے غیر طبقاتی انسانی سماج کو فروغ دیا۔ جنس نگاری کے حوالے سے فرائیڈ کے افکار و نظریات سے بھی استفادہ کیا۔ ادیبوں نے تحت الشعور اور دوسرے نفسیاتی حوالوں سے جنسی تعلقات کا پرچار کیا۔ ادب کے سنجیدہ قارئین نے جنس نگاری کا کھل کھلا پرچار فحاشی کے مترادف تھا جبکہ ترقی پسند ادیبوں نے فحش نگاری کے الزام کو یکسر رد کر دیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ادب معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ جس زندگی کو انھوں نے تحریری روپ میں پیش کیا وہ حقیقت سے ماورا نہیں ہے۔ ان کے کرداروں کا تعلق جیتی جاگتی زندگی سے ہے۔ محبت اور جنس معاشرے کا حصہ ہے۔ ہر ادیب اس کے اظہار کے لیے فطری حق رکھتا ہے۔ کرشن چندر جنس نگاری کو حقیقت نگاری کا نام دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ترقی پسند ادیبوں نے موجودہ دور میں محبت کی صحیح حقیقت کا اجاگر کیا ہے۔ وہ شمع پروانہ کی بے معنی حکایتوں میں الجھ کر نہیں رہ گئے بلکہ انہوں نے ہمیشہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح موجودہ سماج کی بہمنیت وشقاوت، محبت کی شمع کو گل کر دیتی ہے۔"(۹)

ناول "زینہ" ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جسے زندگی کا میابی کا "زینہ" چڑھنے پر اُبھارتی ہے۔ یوں وہ کامیابی سفر پر چلتے ہوئے اپنی پہچان، محبت اور نظریہ سب کچھ چھوڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور خود کو ایسے مسئلے میں پھنسا لیتا ہے جس کو حل کرنے سے کوئی ریاست بھی پہلو تہی کرتی ہے۔ ناول میں اقلیتی برادری کے مسائل بھی اُجاگر کیے گئے ہیں۔ ملکی سیاست پر بات کی گئی ہے اور پس پردہ رہ کر ملکی معاملات کو کنٹرول کرنے والوں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر عطاالرحمن اس ناول کے متعلق لکھتے ہیں:

"ناول کا کینوس صحافتی، مجلسی، سماجی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔۔۔ ناول میں معاشرتی تضاد کو سلیقے سے ابھارا گیا ہے۔۔۔ "زینہ" ورکر کلاس کے انسان کی کہانی ہے، محبت اور رومانس پر مبنی دہشتگردی اور افراد کے لاپتہ ہونے والے مسائل کے حوالے سے ایک سنجیدہ کاوش ہے۔"(۱۰)

ناول کی پوری کہانی مرکزی کردار "فہیم" کے گرد گھومتی ہے۔ کہانی کے آغاز میں وہ اپنے بے کار وقت کے مصرف کے لیے مشاورتی دفتر کا آغاز کرتا ہے۔ جہاں وہ اور اس کے دوست گپ شب کر کے بے کار کا وقت گزارتے، راشد خان زادہ نامی صحافی کے اس کی زندگی میں آنے سے پہلے تک اُس کا دفتر برائے نام ہی کام کرتا ہے۔ لیکن خانزادہ کے مشورے اور دفتر پر لکھے خانزادہ کے کالم سے وہ ترقی اور کامیابی کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ کاروبار کی شہرت اور ترقی کے بعد ہادیہ نامی ایک اسسٹنٹ دفتر میں رکھ لی جاتی ہے۔ اب فہیم تعلیم اور اس کے ساتھ ساتھ زراعت کے شعبے کو بھی مشاورت کے لیے شامل کر لیتا ہے۔ یوں ہادیہ تعلیم اور خود فہیم زراعت کے حوالے سے کام کرتا۔ سکولوں سے اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے انھیں کام ملنے لگا۔ اور زراعت کے حوالے سے بھی خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ مختصر یہ کہ فہیم کامیابی کا زینہ طے کرنے لگا۔ اس دوران فہیم کی ملاقات ظفر نامی شخص سے ہوئی جو خود دگاؤں میں رہتا ہے اور بیوی بچے شہر میں مقیم ہیں۔ ظفر ایک مسیحی عورت کے ساتھ گاؤں میں ہے یہ مسیحی عورت اس کی بن بیاہی بیوی اور اس کے بیٹے کی ماں ہے۔ ظفر کے رُعب و دبدبے کی وجہ سے گاؤں کے لوگ اس پر اعتراض نہ کر سکتے تھے۔ ادھر فہیم کے دفتر میں کام کرنے

والی ہادیہ کا تعلق بھی مسیحی برادری سے ہے۔ یوں ان دو اقلیتی برادری کے کرداروں کے ذریعے ناول میں ان کے مسائل اور ان کے ساتھ ہونے والے استحصال کا ذکر کیا گیا ہے۔

ناول میں فہیم، اس کے والدین، بہن فرزانہ، ہادیہ، ظفر اس کی عورت مار تھا، خانزادہ کے کردار موجود ہیں اور ان سب کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی جُڑی ہے۔ فہیم کے والدین کے آپس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔ بات چیت بند ہے، ماں کالے جادو کا علم جانتی ہے اور اپنے علم سے وہ بہت سی باتوں کو پہلے سے جان جاتی ہے، ان کے گھر کا ماحول پر اسرار قسم کا ہے۔ ان تمام حالات میں فہیم کی بہن فرزانہ گھر سے بھاگنے کا ارادہ کرتی ہے لیکن ماں کے موکل اسے آگاہ کر دیتے ہیں۔ اس واقعہ کے بعد فہیم ماں اور باپ کے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور گھر کے ماحول میں بہتری لاتا ہے۔ فرزانہ کے لیے نوکری اور شادی کے فیصلے میں سے نوکری کو بہتر قرار دے کر اُسے خانزادہ کے دفتر میں نوکری دلاتا ہے۔ یوں فرزانہ خانزادہ کے ساتھ مل کر اخبار کو بہت آگے تک لے جاتی ہے۔ اس دوران خانزادہ کو اغواہ کر لیا جاتا ہے۔ ناول کے اس واقع سے کہانی سپنس کا شکار ہو جاتی ہے کہ یہ سب کرنے والے کون ہیں۔ خانزادہ کی رہائی پر فہیم کو پتہ چلتا ہے کہ ظفر بھٹی، خود اس کا باپ کسی ایجنسی سے منسلک ہیں اور خود خانزادہ بھی، اور اس کے انحراف پر اسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ یوں خفیہ اداروں کا ریاست میں عمل دخل، ان کی اجارہ داریوں کا ذکر بھی ناول میں کیا گیا ہے۔ یوں ناول بہت سے موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ سمیں کرن ناول میں خفیہ اداروں کے ذکر کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ”ناول کا بیانیہ ملک کی اِن ان دیکھی قوتوں کے سیاسی کردار و ڈھانچے بلکہ گراس روٹ لیول تک سرایت کر جانے کو بڑی کامیابی و بے باکی سے بیان کرتا ہے اور آپ کو احساس ہوتا ہے کہ یہاں آپ کی زندگی واقعی ایک کھلے بازار میں بڑی ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کون ان کا آدمی ہے۔"[۱۱]

"زینہ" اپنے عہد کا ایک ایسا ناول ہے جو سماجی منظر نامے کو جرات اور بے باکی سے پیش کرتا ہے۔ اس میں بڑھتی ہوئی معاشی و معاشرتی بے ترتیبی اور بدانتظامی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اردو ادب میں گھر کی چار دیواری سے ہٹ کر باہر کے مناظر کو زیادہ قلم بند کیا گیا ہے، باہر کی نسبت اندرونی معاملات کی عکاسی نسبتاً کم ملتی ہے، خالد فتح محمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے "زینہ" میں دونوں کا امتزاج پیش کیا ہے۔ وہ باہر کے معاملات کے ساتھ ساتھ اندر گھر کے معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

اس ضمن میں انہوں نے فہیم کے گھریلو معاملات، مسائل اور الجھنوں کو خوبصورتی سے پینٹ کیا ہے، ظفر بھٹی کی چوہدراہٹ کے ساتھ ساتھی اس کے گھریلو مسائل بھی دکھائے ہیں۔ چوہدری ظفر جو ناول میں اور حوالوں سے اہم دکھایا گیا ہے۔ لیکن مصنف نے اس کے گھریلو الجھاوے بھی گرفت میں لائے ہیں۔ اس ناول میں سیاست، مذہب، اقلیت، دہشت گردی ہر طرح کے پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کے موضوعات کے حوالے سے آدم شیر لکھتے ہیں:

"فطرت کی طرف واپسی، اناؤں کی تسکین، اقلیتوں کی تذلیل، تعلیمی نظام کی کجی، زرعی نظام کی کجی، بدانتظامی، ناانصافی، سماجی جبر اور بہت کچھ اور یہ سب کچھ کہانی کے پردے پر کاڑھا گیا ہے۔"(۱۲)

ناول کے دو اقلیتی برادری کے کرداروں ہادیہ اور مارتھا کے کردار اور ان سے جُڑے مسائل کو اس خوبصورتی سے پینٹ کیا گیا ہے کہ پوری مسیحی برادری کو درپیش مسائل کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ ہادیہ کی زندگی بہت سے مسائل کا شکار ہے۔ اس کا باپ عورتوں کی سپلائی کے سلسلے میں معاشرے میں بدنام تھا اور خود ہادیہ کسی کی بن بیاہی بیوی رہ چکی تھی اور وہ شخص اسے انتظار کے دوراہے پر چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا، مارتھا کے ساتھ بھی ایسے ہی مسائل ہیں وہ ظفر کی بیاہی بیوی ہے جس سے اس کا ایک بیٹا بھی ہے ظفر کے مرنے کے بعد اس کے لیے مسائل پیدا ہو گئے۔ ظفر کے خاندان والوں نے اسے جائیداد میں سے حصہ دینے سے انکار کر دیا، ایسے میں فہیم مارتھا کے حقوق کے لیے کھڑا ہوا جس پر ایک ہنگامہ شروع گیا اور فہیم کو حوالات میں بند ہونا پڑا۔ یہی کہانی کا اختتام ہوتا ہے اور فہیم کے حوالات میں بند ہونے پر سب کا کہنا تھا فہیم یہی سے کامیابی کا زینہ طے کرے گا اور کامیابی سے سیاست میں داخل ہو سکے گا۔

ب۔ مذہبی استحصال:

مذہب ایک افیون ہے جس کے نشے میں انسان کو اتنا مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ وہ کسی اور طرف نہیں سوچ سکتا۔ ان کے سماجی، معاشی مسائل کو مذہب سے منسلک کر کے ان کے منہ بند کروا دیے جاتے ہیں کہ یہ سب ان کی آزمائش ہے، یہ حکمرانوں کے پیدا کردہ نہیں۔ اگر دنیا میں وہ ان آزمائشوں سے گزر رہے ہیں آخرت میں ان کا اجر ملے گا۔ اس طرح مذہب کے اصل سے بے بہرہ رکھ کر معصوم لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اور اس استحصال کا سب سے زیادہ شکار عورت ہوتی رہی ہے۔ مذہب کا سہارا لے کر جس طرح سے عورت کو دبایا گیا ہے کوئی بھی قابل فہم شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ عورت کو فرمانبرداری اور تابعداری کا جو درس

دیا جاتا ہے وہ مذہب کے نام پر دیا جاتا ہے۔ عورت کو مرد کے جوتے پالش کرنے کا کہا جاتا ہے اور توجیح یہ پیش کی جاتی ہے ہمارے مذہب میں عورت کو شوہر کی خدمت و تابعداری کا درس دیا گیا ہے۔ اس لیے جوتے پالش کرو۔ یوں استحصال کی تمام بنیادوں کو مذہب کی آڑ لے کر تحفظ دیا جاتا ہے۔

مذہبی استحصال کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک ہی مذہب کے اندر مختلف رجحانات کے تحت فرقہ بندیاں قائم کر دی گئی ہیں مختلف فرقہ کے لوگ اپنے ہی مذہب کے لوگوں سے الجھتے نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے کو دائرہ مذہب سے خارج سمجھتے ہیں۔ اس طرح ایک کم فہم معاشرہ دیگر مسائل سے غافل ہو کر فرقوں کے اس گھن چکر میں الجھا رہتا ہے۔ آج اس زمین پر کوئی مذہب یا مذہبی فرقہ ایک دوسرے کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے اور یہ سب اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ مذہب کی سچی تعلیمات عام انسان تک پہنچائی نہیں جاتی اور انہیں صرف فرقہ بندیوں میں جکڑا جاتا ہے۔ اس استحصال کی مثال پیش کرتے ہوئے دانیال رضا لکھتے ہیں:

"کوئٹہ میں اہل تشعیہ کا بڑی بے دردی سے قتل و غارت، ہزارہ عوام کی نسل کشی، پاکستان کے منظر نامے کو بہت خون آلود بنا رہے ہیں"۔ (۱۳)

اقلیتوں کے مذہبی استحصال کے حوالے سے بھارت اس وقت سر فہرست ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ماضی سے اب تک ہندو بنیا اپنے انتہا پسند نظریات کی بدولت اپنے مذہب کے علاوہ دیگر کسی بھی مذہب کے ماننے والے کو تحفظ فراہم نہیں کر سکا۔ بالخصوص مسلمان برادری پر بے تحاشا ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ حافظ محمد شہباز عزیز لکھتے ہیں:

"بھارت میں بالخصوص مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے جا رہے ہیں اور ان کی شناخت ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں اس سے یہ خدشہ جنم لیتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے بھارت ایک اور اندلس بننے جا رہا ہے۔" (۱۴)

پاکستان میں اقلیتوں کے مذہبی استحصال کی ایک وجہ یہ ہے کہ ملک پاکستان کی اکثریت آبادی سمجھتی ہے کہ وہ اللہ کی سب سے پسندیدہ قوم ہے اور وہ اس دنیا میں حکمرانی کے لیے اتارے گئے ہیں۔ حکمرانی اور پسندیدگی کا یہ نظریہ بچے کے ذہن میں اس وقت ہی پختہ کر دیا جاتا ہے جب وہ بولنے اور سننے کے قابل ہوتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں یہ بات محفوظ ہوتی رہتی ہے۔ پاکستانی عوام کی اکثریت جو کہ غربت کی زندگی بسر کر رہی ہے وہ بچوں کو روایتی تعلیم کے بجائے مدارس میں بھیج دیتے ہیں۔ مدارس جو

کہ مختلف دینی فرقوں کے الگ الگ ہیں تو ایسے میں یہ مدارس اپنی دینی تشریح اور نظریات کے مطابق تعلیم دیتے ہیں جس کے نتیجے میں ان مدارس کے طلبہ نہ صرف دوسرے مذہب اور عقیدوں کو غلط کہتے ہیں بلکہ اسلام کے دیگر فرقوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

مذہب پر اجارہ داری قائم کرنے والوں نے مذہب کو ایک دوکانداری بنایا ہوا ہے، جس میں گاہک کو اپنے خون پسینے کی کمائی سے ادائیگی کرنی پڑتی ہے لیکن بدلے میں سوائے کٹر تعصبی فریب اور جنت کی تسلی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مذہب کے جاگیر دار انسانوں کے اندر کم علمی کو کم کرنے کی بجائے مزید بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور مذہب کے نام پر ان سے رقم تک بٹورنے سے گریز نہیں کرتے۔ اور یوں عام آدمی تو دنیا میں ہی جہنم کی سی زندگی گزارتے ہیں اور خود یہ جاگیر دار زمین پر ہی جنت سے بھی زیادہ پر تعیش زندگی گزارتے ہیں۔ یوں آج کے اس دور میں مذہب آج ایک مذہب نہیں بلکہ ایک منافع بخش کاروبار اور عوامی استحصال کا ذریعہ بنتا جارہا ہے۔

دینی مدارس کے علاوہ بعض اوقات پڑھے لکھے عوام بھی اپنے بچوں کو اسی قسم کے نظریات کی تعلیم دیتے ہیں۔ آغاز ہی سے انہیں اپنے مسلک اور فرقوں کی دینی تشریحات کے ذریعے اندھی تقلید کا درس دیا جاتا ہے۔ اسطرح بچوں میں ایسا عقیدہ پروان چڑھتا ہے جس کے مطابق ان کا مسلک درست اور بقیہ فرقے اور مذاہب قابلِ نفرت اور واجب القتل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اقلیتوں کو مذہبی استحصال اور اسکے ساتھ ساتھ معاشی اور سماجی استحصال کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مذہب کو اس قدر حساس بنا دیا گیا ہے کہ کسی بھی قسم کے مذہبی بیانیے اور دینی تشریحات سے اختلاف کرنا گناہِ کبیرہ اور واجب القتل قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے دینی تشریحات اور جدید تقاضوں میں ہم آہنگی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جس کی وجہ سے اقلیتوں کے عقائد سے نفرت اور ان کا مذہبی استحصال پیدائشی حق اور ثواب سمجھا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے مذہبی استحصال کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ روایتی مذہبی تعلیم کے نظام میں اصلاحات کی جائیں۔ تا کہ بچے بڑے ہو کر دوسرے مذاہب اور فرقے کے افراد کے ساتھ پر امن طور پر رہ سکیں۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ عورت کو اگر تعلیم سے روکنا ہو، معاشی سرگرمی سے یا کسی سیاسی قدم سے، ان سب کے لیے بھی مذہب کی ہی آڑلی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ عورت ہو یا کوئی بھی انسان جس کو مذہب سے مکمل آگاہی نہیں، مذہب پر قابض طبقہ کسی نہ کسی طرح ان کو استحصال کا نشانہ بناتے ہیں۔ ہونا تو یہی چاہیے مذہب سے ناواقف لوگوں کی راہنمائی کر کے ان کو مذہب سے مکمل آگاہی فراہم کی جائے لیکن ایسا بہت کم

ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی لاعلمی یا کم فہمی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مذہب کے حوالے سے ڈرایا، دھمکایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سائنس یا کسی بھی قسم کی سائنسی تحقیق کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے بھی مذہب کو ہتھیار بنایا جاتا ہے۔ انسانی آزادی کو بھی مذہب کے نام پر سلب کیا جاتا ہے اور یہ سب کچھ مذہب پر اجارہ داری کرنے والا طبقہ اپنے مفاد کے لیے کرتا ہے۔ اگر کوئی بھی کشمکش یا الجھن دور کرنے کے لیے سوال کرے تو مذہبی طبقہ کی جنونیت ،وحشت جاگ جاتی ہے۔ فتوے لگا دیئے جاتے ہیں اور سوال کرنے والا اپنی جان بچانے کے لیے منہ بند کر لیتا ہے۔

اکیسویں صدی میں جتنا بھی ادب لکھا گیا یا لکھا جا رہا ہے، اس میں ملکی و بین الاقوامی مسائل کا کھل کر تذکرہ کیا گیا ہے، خالد فتح محمد نے بھی اپنے ناولوں میں دونوں حوالوں سے مجبور، ظلم و جبر، غربت وافلاس، مذہبی قید بندیوں اور دہشتگردی میں جکڑے انسانوں کی ترجمانی کی ہے۔ پروفیسر سحر انصاری "اکیسویں صدی اور ادیب" کے موضوع پر لکھتے ہیں:

> "اکیسویں صدی کے ۱۹ سال گزر چکے ہیں ہمارا معاشرہ مسلسل بے یقینی، دہشت گردی، مایوسی اور خطرات کے اندیشوں کا شکار ہے۔ ہمارے خطہ ارض پر انسانی سطح کے حوالے سے جو اذیت ناک سانحے ہو رہے ہیں وہ کسی خاص علاقے تک محدود نہیں، کہیں بھی امن و سلامتی کا مکمل چراغاں نظر نہیں آتا۔ اندھیرے زیادہ ہیں روشنیاں کم، حالانکہ یہ کوئی تقدیر مبرم نہیں ہے۔"(۱۵)

خالد فتح اپنے کرداروں کے ذریعے درج بالا حالات پر عوام سے مکالمہ کرتے ہیں۔ وہ عوام کو سیاسی معاشی اور مذہبی جکڑ بندیوں سے آزاد کروا کر ان کے لیے خوشیاں اکٹھی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جس کی آزادی کی ڈوریں فیوڈل لارڈز، سرمایہ داروں اور برسر اقتدار طبقے کے ہاتھوں میں ہوں۔ تو ادیب ایسے معاشرے کو اپنے قلم کے زور سے آزادی کا احساس دلاتا ہے۔

خالد فتح محمد کا کام بھی یہی ہے، وہ جراتمندانہ انداز میں اپنے قلم سے یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے کردار معاشرے میں پائے جانے والے قول و فعل کے تضاد کو جراتمندی سے سامنے لاتے ہیں اور وقت آنے پر قوم کے نام نہاد مسیحاؤں کے چہرے سے نقاب کھرچنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ناول "زینہ" کا موضوع بھی معاشرے کے بگڑے ہوئے حالات ہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں لوگ جنونیت کا شکار ہو کر

خود اعتمادی کھو بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ مذہب اور فرقے کو بنیاد بنا کر دشمنیاں پھیل رہی ہیں ایک ہی فرقے کے لوگ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔

اس تمام معاشرتی ناآسودگی کی وجہ لوگوں کی مذہب کے متعلق کم علمی ہے، اور مذہب پر اجارہ داری کرنے والے اپنے مفاد کے لیے لوگوں مذہب سے بے بہرہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ مذہب کو لے کر معاشرے میں پھیلی بے سکونی کو ناول میں مرکزی کردار فہیم کے ذریعے مکمل بیان کیا گیا ہے۔

خالد فتح محمد کا کمال ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے کو نعرہ یا پروپیگنڈہ بنا کر پیش کرنے کے بجائے نارمل انداز میں کرداروں کے درمیان مکالموں یا سوچ کے ذریعے بیان کر دیتے ہیں۔ "زینہ" میں بھی مذہب کے نام پر ہونے والی دشمنیوں اور دہشتگردی کو بڑے پرسکون انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "سیاست اور مذہب کے درمیان میں ایک میدان کارزار طے ہو چکا تھا اور مذہب کو مکمل طور پر نا سمجھنے والے مذہب کو اپنے مفادات میں استعمال کر کے سستی شہرت کے متلاشی تھے، مذہب ان کے لیے ایک اوزار تھا۔"(۱۶)

ناول کے ایک پیراگراف میں ہی مذہب پر بے جا حکمرانی کرنے والوں کو بے نقاب کر دیا اور دکھایا ہے کہ کس طرح یہ لوگ اپنے مفاد کے لیے دین کو استعمال کرتے ہیں لوگوں کو دین کی اصل آگاہی دینے کے بجائے صرف اپنی مرضی کی تعلیمات لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ دین کو جبر کے طور پر پیش کرتے ہیں، مدرسوں، مسجدوں میں لوہے اور سریوں سے مار پیٹ ایک عام بات ہے۔ اس تشدد پر انہیں کوئی باز پرس کرنے والا نہیں، یہی وجہ ہے کہ لوگ دین سے دوری اختیار کیے ہوئے ہیں، مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے اس قدر شدت پسندی پر لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہیں۔ ایک عقیدے کے لوگ دوسرے عقیدے کے افراد کو دین سے ہی خارج سمجھتے ہیں۔ دھماکے اور خودکش حملے روز کا معمول ہیں۔ مذہب کو لے کر معاشرے میں پھیلی اس بدامنی کے ذمہ دار مذہبی ٹھیکیدار ہیں۔ جو لوگوں کو دین سے بے بہرہ رکھ کر ان کا مذہبی استحصال کر رہے ہیں۔

ناول میں فہیم اور ایک عیسائی کردار کی گفتگو میں بتایا گیا کہ مسجد کے مولوی گاؤں کے چوہدری سے جمعے کے خطبے کی اجازت لیتے ہیں اور فالتو بات کرنے پر مولویوں کو سزا دی جاتی ہے۔ اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاقوں یا گاؤں پر حکومت کرنے والوں کی مسجدوں اور مولویوں پر بھی مضبوط گرفت ہے اور وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرواتے ہیں۔ ناول میں مذہبی کارندوں پر طنز کی گہری ضربیں لگائی گئی ہیں۔ مذہب چاہے

اسلام ہے یا عیسائی یا کوئی اور ان تمام مذاہب پر اجارہ داری کرنے والوں کے مکروہ چیزوں کو بھی ناول میں بے نقاب کیا گیا ہے۔ ناول میں ایک جگہ عیسائی کردار مارتھا کہتی ہے۔

"میری ماں نے میرے باپ کو نکال دیا اور کچھ عرصہ ایک پادری کے ساتھ تعلق رکھا اور پادری جب بھی گاؤں آتا بند کمرے میں ماں کے گناہ معاف کرواتا۔"(۱۷)

ناول میں اس جملے کے ذریعے مذہبی رہنماؤں کا لبادہ اوڑھے لوگوں کو بے وقوف بنانے والوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

i۔ مسلمان اور عیسائی برادری کی کشمکش:

ناول زینہ میں دو عیسائی کرداروں ہادیہ اور مارتھا کے ذریعے مسیحی برادرری کو درپیش مسائل کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ اس اقلیتی فرقے کے بارے میں اظہار خاصا بولڈ موضوع ہے اور ہر کوئی اس اظہار کی جرات نہیں کر سکتا، شاید اس اقلیتی طبقے کے لکھاری بھی نہ کر سکیں، لیکن "زینہ "میں خالد فتح محمد نے یہ جرات کر دکھائی ہے۔ جس طرح مسیحی برادری کے حق میں آواز اٹھائی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس حوالے سے مسیحی برادری کا نمائندہ کردار مارتھا ہے۔ جو کہ ایک مضبوط کردار ہے وہ ایک زمین دار ظفر کی بن بیاہی بیوی جس کو جائیداد میں بھی حصہ دار بنایا ہوا ہے۔ لیکن ظفر کے مرتے ہی اس کے بیوی بچوں نے مارتھا اور اس کے بیٹے کو حصہ دینے سے انکا کر دیا، یوں ظفر کے مرتے ہی مارتھا کے لیے مسائل پیدا ہو گئے۔ فہیم نے مارتھا کو گھر میں پناہ دی اور اس کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی جس پر معاشرے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور فہیم کو جیل جانا پڑا۔ یوں ناول میں مارتھا کو لے کر مسیحی برادری کو درپیش مسائل اور ان کے استحصال کو سامنے لایا گیا ہے۔ مارتھا جو کہ ظفر کے ساتھی رہ رہی ہے وہ اب نہ تو مسیحی برادری میں قابل عزت ہے اور نہ مسلمان طبقہ اسے اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن یہ سب ظفر کے ڈر سے چُپ سادھے ہوئے ہیں۔ مارتھا کی گفتگو ملاحظہ ہو جس وہ معاشرے میں اپنے مقام اور حیثیت پر بات کرتی ہے۔

"چوہڑے مجھے اپنا نہیں سمجھتے، وہ کہتے ہیں کہ اس نے اپنا آپ بیچ دیا۔۔ مسلمان مجھے قبول نہیں کرتے، ایک تو میں ان میں سے کسی کا حق مارے ہوئے ہوں اور دوسرا ان کے مذہب میں نہیں جا رہی۔"(۱۸)

مارتھا کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے پر مسلمان اور مسیحی برادری کے درمیان ایک جنگ اور کشمکش کا آغاز ہوا۔ فہیم کو گستاخ اور قانون شکن قرار دیا گیا۔ فہیم اور ظفر کی سوچ ہے کہ مسیحی برادری میں شادی اور

تعلق جائز ہے جبکہ ہمارا معاشرہ اقلیتوں کو مسلمان کرنے کی کوشش میں ہے اور اس کے لیے وہ تشدد اور جبر کو اپنانے سے بھی گریز نہیں کرتے، اور ہمارے ذہنوں پر بھی یہی سوچ مسلط کر دی گئی ہے کہ اقلیتیں یا ملک چھوڑ جائیں یا اسلام قبول کر لیں جبکہ حقیقت تو یہ کہ یہ ملک جتنا ہمارا ہے اتنا ہی اقلیتوں کا بھی ہے۔ ان کو آزادی اور برابر کے حقوق ملنے چاہیے۔ فہیم کے والد اقلیتوں کے حق میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میں کہتا ہوں اقلیتیں ہماری زمین سے اگنے والے پھولوں کی طرح ہیں جن کی خوشبو دوسرے پھولوں کی طرح ہے۔"[۱۹]

ناول کا وہ حصہ جس میں دو مسلمان مرد ایک عیسائی عورت سے جنسی مکالمہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں مردوں میں ایک مسلمان مرد کسی اور مسیحی عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور وہ مسیحی عورت اپنی مرضی سے مکالمہ کرنے والے دوسرے مرد سے ایک خواب نما ہم بستری کرتی ہے جو شاید ایسی گزرتی عمر کی اپنے سے چھوٹے عمر کے مرد سے ایک آخری ہم بستری ہوتی ہے ایک جملہ جو اس عورت کے منہ سے نکلتا ہے جو ہمارے سماج کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ ہے وہ کہتی ہے تم مسلمان مرد ہم عیسائی عورتوں کو کھوتیاں سمجھتے ہو۔ یہ بھی ہمارا ایک سماجی سچ ہے ہم اپنے سماج کی اقلیتوں اور خاص طور پر اقلیتی عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

اس ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ میں ہندو عورتوں اور پنجاب میں عیسائی عورتوں کے ساتھ شادی کے واقعات آئے دن اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارا مائنڈ سیٹ اس طرز پر استوار ہے کہ اپنے آپ کو برتر اور دوسرے مذاہب کو کمتر سمجھو اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر رکھو۔ ناول کے اس نکتے کو اگر محرک بحث بنایا جائے تو بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے مردوں عورتوں کے آپسی مذاہب تعلقات یعنی دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے مرد عورت کے جسمانی تعلقات خاصے کم ہیں۔ ان سے بہت کم آپس میں قانونی طور پر شادیاں کرتے ہیں۔ بہر حال یہاں اٹھائے گئے سوالات ایک بڑی بحث کا باعث بن جاتا ہے۔ ہماری تعلیم ہمیں سیکس کو گناہ سمجھنے کا ذریعہ بناتی ہے۔ کیا یہی وجہ ہے کہ مشرقی عورتوں کی بستر میں پھڑک کم ہو جاتی ہے جب کہ یورپ امریکہ کی عورتیں زیادہ بھرپور ہیں۔

ناول میں دکھایا گیا ہے کہ معاشرے میں ایسے بھی لوگ ہیں جو ان اقلیتوں کے لیے لڑ رہے ہیں لیکن ایسا کرنے والے کو قانون شکن قرار دے کر جیلوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جس کی مثال ناول کا مرکزی کردار

فہیم ہے، فہیم نے مارتھا کو ساتھ رکھ کر ایک احتجاج کا آغاز کیا، جس میں خانزادہ کے ٹی وی چینل نے اسے کوریج دی اور یہ احتجاج ایک ملک گیر حی اختیار کر گیا اور بالآخر مذہبی جماعتوں کو ان سے ملاقات کے لیے آنا پڑا۔

مذہبی علماء کے گروہ پر بھی گہری چوٹ ناول میں کی گئی ہے اور ناول کے کردار مارتھا نے ان کی شرافت کے لبادے کو گہرے طنز سے بے نقاب کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس گروہ میں ایک مولوی ہمارے گاؤں کی مسجد میں تعلیم دیتا تھا۔ اسے وہاں سے نکال دیا گیا اور ذلالت کے ساتھ نکالا گیا، میں اسے اس واقعے کی یاد لاؤں گی۔ باقی بھی ایسے ہی ہوں گے۔

علماء سے ملاقات کے دن ان کے آنے سے پہلے ایک سٹیج سجایا گیا، مائیک اور لاؤڈ سپیکر لگائے گئے، پھر مہنگی گاڑیوں میں سے مولوی بر آمد ہوئے، ان کے چیزوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں احتجاج والوں کے لیے نفرت تھی۔ ایک کشمکش کی کیفیت تھی، مجمع کے لوگ جارحیت سے انھیں دیکھ رہے تھے ایک پادری بھی نمودار ہوا اور سٹیج پر پہنچا۔ جلسے کا آغاز تلاوت سے ہوا اور اس کے بعد جلسے کا مقصد بیان کیا گیا کہ بین المذاہب کچہری ہے اقلیتوں پر ظلم کا الزام لگانے والوں کو گرفت میں لایا جائے گا، بزرگ مولوی کا کہنا تھا کہ ان کے ملک میں اقلیتوں کو برابر کے حقوق ملتے ہیں۔ مولوی کی گفتگو کے ذریعے اقلیتوں کے لیے آواز اٹھانے والوں کو غلط ثابت کیا گیا اور اب پادری کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ بھی یہی کام کرے۔ اس تمام منظر میں فہیم کی مختصر سی گفتگو نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا، فہیم پادری کے مائیک تک پہنچنے سے پہلے وہاں جا پہنچا۔ فہیم کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

> "یہاں جو کہا گیا درست نہیں اور جو کہا جانے لگا تھا، وہ بھی درست نہیں ہو گا۔ آج کی کھلی کچہری ایک دھوکا ہے۔ اگر اقلیتی انصاف ہوتا تو پادری صاحب کو بھی اپنے مقدس کلام کی تلاوت کا کہا جاتا۔"[۲۰]

فہیم کی اس گفتگو نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ شور تھا اور لوگ گتھم گتھا تھے، اس سب ہنگامے میں فہیم کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک مہینہ جیل میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ فہیم کی اس کوشش کے نتیجے میں اسے سزا سنا دی گئی لیکن اس کے والد نے اس کا حوصلہ بڑھایا اسے تاکید کی کہ یہ سب ہمت سے برداشت کرو، یہاں سے نکلنے کے بعد تم سیاست میں کامیابی سے قدم رکھ سکو گے۔ جیل جانا اس کی پہلی پرواز قرار دیا گیا۔

اقلیتوں کے لیے احتجاج میں خانزادہ نے بھی بھرپور ساتھ دیا جس کی وجہ سے اس پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا، حملہ کرنے والے بھی یہی لوگ تھے، جو اس احتجاج کے مخالف تھے، ان کا کہنا تھا کہ اس ملک نے اقلیتوں کو رہنے کے جو ذرائع دیے ہیں انہی کی حدود میں وہ گزر بسر کریں، بصورت دیگر ان پر حملہ بھی کیا جا سکتا ہے،

ان کا موقف تھا کہ یہ سب بیرونی طاقتوں کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ اور احتجاج کے نمائندہ افراد ان کے ایجنٹ ہیں۔ مذہبی رہنماؤں نے جوابی کاروائی کے لیے غربت کے مارے خاندان کے نوعمر لڑکوں کو چوک میں کھڑا کیا جو مائیک پر مذہبی راگ الاپتے اور اقلیتوں پر لعنت بھیجتے، اقلیتوں کے لیے آواز اٹھانے والے مجمعے کو چوہڑے کہہ کر پکارا جاتا۔

ناول کے اس تمام قصے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں یہ بات کسی طور پر قابل قبول نہیں کہ کوئی اقلیتوں کے حقوق کی بات کرے، یہ لوگ ان کو کمتر سمجھ کر اپنے ماتحت رکھنا چاہتے ہیں۔

ج۔ اقلیتی برادری کا استحصال:

خالد فتح محمد جہاں اپنے ناولوں میں معاشرے کے دیگر مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وہاں وہ اقلیتی برادری کے مسائل اور اس طبقے کے استحصال کو قطعاً نظر انداز نہیں کرتے، ناول "زینہ" میں بھی مصنف نے اس طبقے کے لیے کئی بین السطور اور کہیں پر برملا آواز بلند کی ہے، وہ نعرہ بازی کی فضا پیدا نہیں کرتے، بلکہ کرداروں اور ان کے ارد گرد کے حالات واقعات کا تانا بانا ہی اس طرح بنتے ہیں کہ خود بخود مطلوبہ نتائج سامنے آجاتے ہیں، جن کی توقع ناول نگار نے نتائج سے رکھی ہوتی ہے۔

i۔ عیسائی برادری کے خلاف نفرت:

اقلیتوں پر مذہبی پابندیوں کا ذکر تو ناول میں آیا ہی کہ کسی طرح ہمارے مذہبی رہنما ان کو دائرہ اسلام میں لانے کے لیے اکساتے ہیں۔ جبر بھی کرتے ہیں ان کی مذہبی رسومات کے لیے رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشی لحاظ سے اس طبقے کو درپیش مسائل پر نہ صرف سوال اٹھایا گیا ہے۔ بلکہ ناول نگار نے ناول میں ایک احتجاج کے منظر رکھا کر ظاہر کیا ہے کہ معاشرے میں ابھی بھی کچھ افراد ہیں جو اقلیتوں کو ان کے حقوق دلانا چاہتے ہیں۔ حفیظ تبسم خالد فتح محمد کے اس موضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

> "جس اقلیتی فرقے اور اس کے کرداروں کے بارے میں اس ناول میں اظہار ہوا ہے خاصا بولڈ موضوع ہے اور شاید خود اس اقلیتی فرقے کے لکھاری بھی ان میں خالد کا ایک دوست اور شاگرد شامل ہے یہ جرات نہ دکھا سکے، اصل میں متعلقہ ہو کہ غیر متعلقہ ہونا یا دکھانا یا غیر متعلق ہو کہ خود کو متعلق دکھانا مشکل چیز ہے اور یہ کام خالد نے کیا ہے۔"[۲۲]

ہادیہ جس کا تعلق مسیحی برادری سے ہے اس کا باپ اقلیت ہونے کی وجہ سے قانون کی گرفت میں آچکا تھا۔ اس کا یہ جرم تھا کہ وہ کسی دور میں اعلیٰ افسروں تک عورتوں کو جسم فروشی کے لیے وسیلے کا کام کرتا ہے، کچھ وقت تک یہ کام خفیہ رہا لیکن جب اس کی خبر سب کے سامنے آئی تو وہ افسران اور عورتیں جو رضا مندی سے اس کام میں شامل تھے، سب کے سب غائب ہو گئے اور ہادیہ کا باپ سلیمان اس لیے گرفت میں آگیا کیونکہ وہ عیسائی تھا۔ اس جرم میں اسے اپنا محلہ چھوڑ کر گمنامی کی زندگی گزارنی پڑی، لوگ اسے معاف نہ کر سکے، خانزادہ نے اُسے اپنے اثر ورسوخ سے سزا سے تو بچا لیا لیکن باقی زندگی گمنامی اور خوفزدگی میں گزاری۔ فہیم اور ظفر کی اس سلسلے میں ہونے والی گفتگو میں ظفر نے بتایا کہ یہ سب فرقہ وارانہ نفرت کی بنا پر ہوا، سلیمان کو مارنے کی کوشش بھی ہوئی لیکن وہ بچ گیا، اور یہ تمام کام ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا، سلیمان مالی طور پر آسودہ نہ تھا یہی کمزوری اس کی استعمال کی گئی اور اسے اس نئے پیشے کی طرف راغب کیا گیا۔ اس حوالے سے ظفر کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

"یہ ترغیب ایک بڑے پلاٹ کا حصہ تھا۔ اُسے ان مخصوص عورتوں کے ساتھ ملایا گیا
اور یہ سلسلہ چل نکلا سلیمان خوش تھا کہ اچانک آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔
اسے اس کام میں ڈالنے والوں کے ارادے کچھ اور تھے۔ اب ایک اور کافر کو انھوں
نے راہِ راست پر لانا تھا یا موت اس کے مقدر میں تھی۔" [۲۳]

سلیمان روپیہ اکٹھا کر رہا تھا اور دوسری طرف اس پر شکنجہ سخت کیا جا رہا تھا اور خبر سامنے آنے پر باقی کے سب منظر نامے سے غائب ہو گئے اور کیچڑ سلیمان پر آ گرا۔ کیونکہ وہ اقلیت برادری سے تھا اور اس کے پاس اپنے دفاع کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ صورتحال ہادیہ اور اس کے خاندان کی تھی۔ ہادیہ کے علاوہ مارتھا کا کردار بھی ہے جس کا تعلق اقلیت سے ہے۔ ہادیہ کے مقابلے میں مارتھا کا کردار زیادہ مضبوط اور متحرک دکھائی دیتا ہے، مارتھا اپنی گفتگو کے دوران اکثر و بیشتر اپنی محرمیوں اور سماجی حیثیت کا تذکرہ کرتی ہے جس میں وہ خود کے ساتھی زیادتی کرنے والوں پر طنز کرتی ہے۔

چوہدری ظفر کے ساتھی بغیر نکاح کے رہنے پر معاشرے میں اسے ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھا جاتا، لیکن چوہدری ظفر کے زندہ رہنے تک وہ محفوظ رہی، اس کی موت کے بعد اس پر زندگی کا دائرہ تنگ ہونے لگا۔ اسے مسلمان بھی نفرت سے دیکھتے اور عیسائی برادری بھی اسے اپنانے کے لیے تیار نہ تھی۔ مارتھا نے بتایا کہ بچپن میں جب ان کے مالی حالات اچھے نہ تھے ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرتی اور جب میں بڑی ہوئی اور مجھے

بھی کام پر لگا لیا اور جب مجھ پر جوانی آئی بہت سے مردوں کی مجھ پر نظر تھی، اور ایک دن حویلی والے کے بیٹے نے مجھے اپنے شکنجے میں دبوچ لیا۔ مارتھا بتاتی ہے کہ:

"حویلی والے کا بیٹا اور میں جب بھی ملاپ کرتے مجھے اپنے بدن سے گندی قسم کی بو آتی میں ہر ملاپ کے بعد سوچتی کہ کوئی ایسی دوا ہو جسے کھا کے میں از سر نو کنواری بن جاؤں۔"(۲۴)

مارتھا کی گفتگو کے اس حصے سے اس کی محرومیاں جھلکتی ہیں کہ کس طرح غربت کی ماری لڑکیوں کو ہر کوئی اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا لیتا ہے۔ پھر اسے چوہدری ظفر کے گھر بھیج دیا گیا۔ یہاں ہر چیز اس کے آنے سے مسکرانے لگی۔ حتیٰ کہ چوہدرری ظفر بھی، مارتھا خوش بھی تھی اور نہیں بھی، وہ قید تو نہیں تھی لیکن آزادی بھی میسر نہیں تھی۔ مارتھا حسرت سے کہتی کہ اس کا دل کرتا ہے وہ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرے۔

"میرا دل کرتا ہے جب ہم فاختہ کے بچے چھوڑیں تو میں بھی ان کے ساتھ ایک پرواز لوں اوپر کی ہوا میں شاید میرا بدن پاک ہو جائے۔"(۲۵)

مارتھا کی اس گفتگو سے ظاہر ہے کہ وہ چوہدری ظفر کے ساتھ بغیر نکاح تو رہ رہی ہے۔ لیکن وہ اپنی اس سماجی حیثیت سے خوش نہیں ہے۔ کیونکہ اسے ڈر ہے کہ چوہدری کا خاندان اسے کبھی اس کا حق نہیں دے گا اور وہ نہ تین میں ہو گی اور نہ تیرہ میں۔ چوہدری ظفر کی موت کے بعد اس کا یہ ڈر سچ ثابت ہوا اور اسے گھر سے بھی نکال دیا گیا اور جائیداد سے بھی محروم کیا گیا۔ اقلیتوں کے حقوق کے لیے ہونے والے احتجاج میں مارتھا سے اس کے مطالبات پوچھے تو مارتھا نے ایک زبردست نقطہ سامنے لایا۔ مارتھا کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

"میں عیسائی ہوں اور جب بھی صفائی کرنے والوں کی ملازمتوں کا اشتہار آتا ہے تو صرف عیسائیوں کو درخواست دینے کا کہا جاتا ہے جو ایک تعصب ہے۔"(۲۶)

مارتھا کا یہ اعتراض سو فیصد درست ہے کہ صفائی کے لیے خالی آسامیوں پر اسی طبقے سے درخواست طلب کی جاتی ہے۔ اگر سوچا جائے یہی طبقہ اپنے حقوق کے لیے کھڑا ہو جائے اور احتجاجاً صفائی کا کام روک دے تو ہمارے معاشرے میں صفائی کی صورتحال کیا ہو گی۔ ہم پاکیزگی اور صفائی کا لبادہ اُوڑھے کیسے اپنی اپنی گندگیوں کو سمیٹیں گے۔

فہیم کے سامنے اپنے دکھ سکھ بیان کرتے ہوئے مارتھا نے ایک ایسا جملہ کہا جو ہمارے معاشرے کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے۔ اس کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ مسلمان مرد ہمیں عیسائی عورتوں کو کھوتیاں سمجھتے

ہیں ان کی عورتیں پاک ہیں یہ ایسے اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی ان کی عورتوں کو بھگا کر لے جائے گا اور یہ بے سہارا رہ جائیں گے جتنی میں بدنام ہوئی اُتنا کوئی نہ ہوا ہو گا میں عزت دار زندگی اس لیے جی رہی ہوں کہ ایک عزت دار آدمی اپنی مایوسیاں میرے اندر پھینک کر مجھے گندا کرتا رہتا ہے۔ میرا ظاہر صاف اور باطن گندا ہے، عیسائی مجھے اپنا نہیں مانتے اور مسلمان بھی قبول نہیں کرتے۔ اور مولویوں کی طرف سے ملنے والے پیغامات کے متعلق کہتی ہے:

"مجھے مولوی کے کئی پیغام آتے ہیں کہ اگلے جہان میں سکھی رہنے کے لیے مسلمان ہو جاؤں کیا کروں گی وہاں سکھی ہو کے۔ ابھی تک یہاں تو سکھ ملا نہیں۔"(۲۷)

مارتھا کی گفتگو کو دیکھا جائے تو یہ ہمارے سماج کا تلخ سچ ہے کہ ہم اپنے معاشرے میں اقلیتوں اور بالخصوص ان کی عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے ہیں۔ ہمارے نام نہاد شریف لوگ ان سے اپنی ہوس تو پوری کر لیتے ہیں لیکن ان کو اپنے نکاح میں رکھنا باعث شرم محسوس کرتے ہیں۔ شروع سے ہمارے دماغوں میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ خود کو برتر اور دوسرے مذہب اور ان کے لوگوں کو کمتر سمجھو اور ان کی عورتوں کو اپنی لونڈی کی حیثیت دو۔

ناول کے اس نکتے کو دیکھیں تو اس حوالے سے یہ طبقہ واقعی استحصال کا شکار ہے بہت ہی کم مختلف مذہب کے لوگ آپس میں قانونی طور پر شادیاں کرتے ہیں۔ لیکن ان سے ناجائز تعلق استوار کرنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے۔

اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خالد فتح محمد نے جس طرح سے اس طبقے کے لیے آواز اٹھائی ہے اور جس انداز سے ان کے مسائل کو سامنے لایا وہ سب داد کے قابل ہے۔ مصنف نے اپنا کوئی بھی فیصلہ مسلط کرنے کے بجائے ایک راستہ عوام کو دکھایا کہ کس طرح پر امن احتجاج کے ذریعے اپنا حق لیا جا سکتا ہے اور عوام کو احتجاج کا حوصلہ فراہم کیا ہے کمال خوبی سے غیر مسلم لڑکی کو معاشرے میں درپیش مسائل عیاں کیے ہیں۔ اور یہ بھی دکھایا ہے ان اقلیتوں کے لیے آواز اٹھانے والے خود کتنے غیر محفوظ ہیں۔ اس ضمن میں فہیم کی مثال سامنے ہے جسے اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کے جرم میں جیل جانا پڑا۔

د۔ انتظامی اداروں کی طرف سے عوام کا استحصال:

خالد فتح محمد کا ناول "زینہ" ہمارے سماج کی تلخ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس ناول میں سیاستدانوں، انتظامی اداروں، کے منفی کرداروں کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ کس طرح یہ ادارے اور افراد لوگوں کی سماجی زندگی پر

اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی مرضی کے مطابق نہ چلنے پر کس طرح سے عام انسانوں پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا جاتا ہے۔ مصنف کا کمال ہے کہ اس تحریر میں کسی ادارے، سیاستدان کا نام لیے بغیر اس مسئلے کو عمومی طریقے سے بیان کر دیا ہے۔ نصیحت کرنے کے بجائے کہیں کرداروں اور کہیں صورتحال کے ذریعے ان سیاستدانوں اور اداروں کے منفی کرداروں کو حرف تنقید بنایا ہے۔ آدم شیر ناول کے اس موضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ناول "زینہ" میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ بڑی سرکاری سمجھتی ہے کہ جب تک ووٹر باشعور نہیں ہو جاتا، ووٹر پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور تب تک بڑی سرکار کو سیاسی معاملات میں مداخلت کرتے رہنا چاہیے۔ سیاست دان اپنی کمزوریوں کے غلام ہیں اور ان کمزوریوں کو چھپانے کے لیے انہیں بڑی سرکار کی مدد درکار ہے۔"[۲۸]

مصنف نے ملک کی ان دیکھی قوتوں کے ملکی سیاسی نظام میں مداخلت کو بڑی کامیابی و بے باکی سے بیان کیا ہے۔ ناول کو پڑھ کر واقعی یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ انسانی زندگی واقعی کھلے بازار میں پڑی ہے، اس کی قطعاً خبر نہیں کہ کون ان دیکھی قوتوں کے ساتھ ملوث ہے جس فرد پر ان دیکھی قوتوں کی نظر پڑ گئی اسے ان کے اشاروں کے مطابق اپنے حال اور مستقبل کا فیصلہ کرنا ہو گا۔ ان کے اشاروں پر چلنے سے انسان کی سماجی اور بالخصوصی گھریلو معاملات متاثر ہوتے ہیں اور ان قوتوں سے انحراف کی صورت میں بھی زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا جاتا ہے۔ ان حالات سے متاثرہ اشخاص "زینہ" ناول کے ظفر اور صحافی خانزادہ ہیں جن پر آگے کی سطور میں تفصیلی بحث کی جائے گی۔

i۔ افراد کی گمشدگی اور دہشت گردی:

ناول "زینہ" میں دو کرداروں ظفر بھٹی اور صحافی خانزادہ کے ذریعے ریاست کے خفیہ جاسوسی نظام یا جاسوس گھر کے معاشرے پر اثر و رسوخ کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ناول کے یہ دونوں ہی افراد جب تک ان خفیہ اداروں کی ایما کے مطابق چلتے رہے وہ سکوں میں رہے لیکن ان کی چھتری سے نکلنے کی کوشش کی تو دھمکیوں پر اتر آئے، جبکہ صحافی خانزادہ کو تو غائب بھی کر دیا گیا۔

ظفر بھٹی نے فہیم سے گفتگو کے دوران اپنی گھریلو زندگی پر سے پردہ اٹھایا۔ اس کا کہنا تھا کہ آغاز میں اسے ان لوگوں کے لیے کام کر کے مزہ آتا، یہ اس کے کالج کا زمانہ تھا، لیکن جب شادی کا سوچنے لگا تو کہا گیا، شادی اس ذمہ داری میں رکاوٹ بنتی ہے۔ اور ظفر کے معاملے میں یہ بات سچ ثابت ہوئی، وہ بتاتا ہے کہ:

"شادی میرے فرائض کی ادائی میں رکاوٹ بن رہی تھی اور یہی میری شادی شدہ زندگی کی ناکامی کا آغاز تھا۔۔۔میں اپنی بیوی کے ہاتھوں شکست نہیں کھانا چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ میں اسے دھوکہ دے رہا ہوں جبکہ میرے اپنے مسائل تھے۔۔۔ میں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن ان کی گرفت مضبوط تھی"(۲۹)

ظفر کی گفتگو سے واضح ہے کہ وہ ان کے نظریات کا حامی نہیں اور یہ بات اس نے ان پر واضح بھی کی، لیکن نظریات کے ان اختلافات کے باوجود ظفر انہیں چھوڑ نہ سکا کیونکہ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے، خفیہ نظام کے افراد لوگوں کی سماجی زندگی کو اپنی مرضی سے ڈیزائن کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لیے وہ سیاست اور پھر حکومت میں بھی اپنے من پسند افراد کو شامل کرتے ہیں۔ ایسے سیاستدانوں اور حکمرانوں کا اپنا کوئی وژن اور موقف نہیں ہوتا وہ صرف ان کے بتائے راستے پر چلتے ہیں۔اور عوام پر ایک ظالم حکمران کی صورت میں حکمرانی کرتے ہیں۔

ظفر کو اسی بات پر ان سے اختلاف تھا اور یوں ان سے دور ہوتا گیا۔ یہ لوگ نوجوانوں کی زندگیوں سے کھیلنا چاہتے تھے۔، وہ اپنی غرض کے لیے نوجوانوں کو جبراًیا ان کے گھر والوں کو مال دے کر جہاد کے لیے قائل کرتے۔ اس کام کے لیے وہ غریب کا انتخاب کرتے، انہیں اس سے غرض نہیں کہ کون مرے گا اور کون زندہ بچ جائے گا، ظفر بتاتا ہے کہ:

"لوگ نوجوانوں کی قیمت وصول کر رہے تھے اور انھیں وہاں بھیجا جا رہا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی"(۳۰)

خالد فتح محمد نے ظفر کی گفتگو کے ذریعے ان اقتدار کے بھوکے افراد کی مفاد پرستیوں سے پردہ اٹھایا ہے، اپنے مفاد کے لیے یہ قومی مفاد اور قیمتی انسانی جانوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ لوگوں کے سامنے اپنا نام بنانے اور شرافت و ہمدردی دکھانے کے لی دیہاتوں کے باہر بڑی سکرینیں لگا کر ان شہید نوجوانوں کی تصویر لگا دی جاتی ہیں۔ ظفر کا کہنا تھا کہ وہ اس ریوڑ کا حصہ نہیں بننا چاہتا تھا جس کے ہانکنے والے ظالم اور بے رحم ہیں۔ جن کا مقصد صرف انسانیت کے استحصال کے اور کچھ نہ ہو۔ حقیقت میں بھی دیکھا جائے تو آج ہمارے معاشرے کے حالات اسی نظام کی دین ہیں۔ پر امن معاشرہ اب صوبائیت، فرقہ واریت، اور زبان کے جھگڑوں میں الجھا پڑا ہے۔ دہشتگردی ایک معمول بن چکی ہے، جس میں کہیں گھروں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں اور شدید مذمت کرنے کے علاوہ ریاست کے حکمران کچھ نہیں کرتے۔

ظفر نے بتایا کہ ان سے علیحد گی کے بعد اس کے خلاف مہم چلائی گئی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا تو مجھے جانشین مقرر کرنے کا کہا گیا ان کا دباؤ اور ضد بڑھتی گئی، لیکن ظفر ایسا کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اپنے اس فرض کی وجہ سے وہ اپنی شادی شدہ زندگی ناکام بنا چکا تھا۔ ان کے دباؤ اور اصرار پر ظفر نے خانزادہ کا نام دے دیا کیونکہ خانزادہ ان کی امیدوں پر پورا اتر سکتا تھا۔ اس کے کوئی گھریلو معاملات نہیں تھے جو تعطل کا شکار ہوتے۔ یوں ظفر خود اس نظام سے نکلا اور خانزادہ کو ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ناول میں دکھائی گئی اس صورتحال سے سوال اٹھتا ہے کہ پہلے اپنی مرضی سے ان کے کام آنے والے آخر ایک وقت پر خود کو ضمیر کا قیدی محسوس کر کے ان کے لیے کام کرنے سے انکار کیوں کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہے کہ جب انسان کا ضمیر اسے ملامت کرے یا اس بات کی اجازت نہ دے کہ وہ بے گناہ لوگوں کی جانیں داؤ پر لگائے تو ایسے میں اس راہ سے کنارہ کشی کرنا ہی بہتر سمجھتا ہے۔

ظفر کی کہانی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اچانک کسی دن نامعلوم بیماری سے مر جاتا ہے، ظفر کی کہانی سے واضح ہوا کہ اسے ان خفیہ راہداریوں میں گھسنے سے کتنے نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اپنی شادی شدہ زندگی خوشگوار نہ بنا سکا نتیجتاً اس کا خاندان اسے چھوڑ کر چلا گیا وہ نہ چاہ کر بھی ان سے کنارہ کشی نہ کر سکا۔ جاسوس گھر کی معاشرے اور لوگوں کی زندگیوں میں اس حد تک مداخلت پر عبدالوحید سوال اٹھاتے ہیں۔

> "کیا جاسوس گھر کے دائرہ میں شہری زندگی کے تمام امور آتے ہیں۔ کیا لوگ اپنی زندگیاں خود ڈیزائین کرتے ہیں یا جاسوس گھر نے پر ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ کیا ہم سب ایک ڈیزائینڈ فریم کا حصہ ہیں۔ کیا واقعی جاسوس گھر کا اتنا وژن ہے کہ وہ سماج کو اپنی مرضی کے دھارے پر چلا سکے اور سماج ارتقاء کی طرف گامزن رہے" [۳۱]

ناول کا دوسرا کردار جو ظفر کی نسبت زیادہ متحرک نظر آتا ہے، صحافی خانزادہ، جسے زیادہ متحرک نظر آتا ہے۔ صحافی خانزادہ، جسے ظفر نے ان لوگوں کے لیے چنا اور اس کا نام جاسوسی اور مخبری کے لیے ان کے کانوں میں ڈال دیا۔ جب خانزادہ نے بڑی سرکار کی چھت قبول کی تو وہ اخبار کے ایڈیٹر سے ایک چینل کا مالک بن گیا اور سب اچھا چلتا رہا لیکن جیسے ہی خانزادہ نے اس چھتری کے سائے سے ہٹنے کا فیصلہ کیا تو اسے اغوا کر لیا گیا۔ خانزادہ اس وقت تک ان لوگوں کو قابل قبول رہا جب تک وہ ان کی مرضی کے مطابق وزیرستان سے ان کے لیے رپورٹنگ کرتا ہے لیکن جیسے ہی اس نے اپنی منشا کے مطابق رپورٹنگ کرنی چاہی اسے جاسوس گھر کا دوسرا رخ دکھایا گیا اور اسے کچھ عرصہ کے لیے قید خانے میں بند کر دیا جاتا ہے۔

خانزادہ کی قید کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنا تشخص ختم کر کے صحافتی دنیا میں جاسوس گھر کے لیے کام کرے، لیکن خانزادہ نے یہ قبول نہ کیا، قید کے دوران خانزادہ انتظار میں رہا کہ کوئی آئے گا اور اس سے اس معاملے پر گفتگو کرے لیکن ایسا کچھ نہ ہو اور خانزادہ کو کچھ دنوں کی قید کے بعد فہیم اور اس کے والد کو بلا کر کے ان کے سپرد دیا گیا۔ خانزادہ کی رہائی پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ فہیم کا والد بھی جاسوس گھر کا مخبر ہے۔ خانزادہ پر جسمانی تشدد تو نہ کیا گیا لیکن اس کی ذہنی حالت غیر متوازن کر دی گئی اور وہ راتوں کو اٹھ کر ون ایکٹ ڈرامے کرتا۔ جاسوس گھر کی چھتری ناول کے اختتام پر فرزانہ کے سر پہ بھی آتی ہے، بدلے میں وہ ان کے کہنے پر ایک پریس کانفرنس کے ذریعے ملک کے سیاستدانوں کی بدعنوانیاں سامنے لاتی ہے اور اسے یہ تمام معلومات جاسوس گھر فراہم کرتا ہے۔ ظفران کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> "ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ تعداد میں صرف چند لوگ ہوتے تھا اور پورے علاقے کو انہوں نے تگنی کا ناچ نچایا ہوتا۔ المیہ یہ رہا کہ ہر کوئی ان کے نزدیک رہنا چاہتا تھا اور ان کے کام آنا بھی"(۳۲)

یوں فرزانہ بھی تحفظ کے لیے ان کے کام آنے کو ترجیح دیتی ہے۔ فہیم کے پوچھنے پر کہ یہ کون ہیں جن سے تمہیں تحفظ چاہیے، جواباً فرزانہ نے کہا۔

> "یہ کوئی بھی نہیں اور سب کچھ۔ یہ نہ کوئی آسمانی مخلوق ہیں اور نہ زمینی۔ یہ کہیں سے بھی ہو سکتے ہیں اور کہیں سے بھی نہیں"(۳۳)

خانزادہ کی رہائی کے بعد اس کے دفتر کی تلاشی لی گئی لیکن وہاں سے بھی کوئی ثبوت نہ مل سکے۔ جاسوس گھر کے فرد ہادیہ کے گھر گئے اور اسے بھی دھمکایا کہ خانزادہ کے متعلق جو وہ جانتی ہے بتائے بصورت دیگر اس کے باپ کا قصہ پھر سے سامنے لایا جائے گا۔ یعنی یہ لوگ جب چاہے کسی کو بھی ہراساں کر سکتے ہیں۔ یہ اور ان کے کارندے معاشرے میں ہر جگہ ہر وقت موجود ہیں۔

> "جاسوس گھر جو سماج میں اپنا کردار بہت متحرک اور پر اسرار طریقے سے ادا کر رہا ہے جاسوس گھر کی پر اسراریت اس ناول میں بھی خالد فتح محمد نے ویسے ہی برقرار رکھی ہے جیسی کہ ہمارے حقیقی سماج میں ہے"(۳۴)

الغرض کہ ریاست کے یہ خفیہ ادارے ہمارے معاشرے اور عام آدمی تک رسائی رکھتے ہیں۔ یہ ادارے معاشرے کو اپنی اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ ان اداروں کے اس گہرے اثر و رسوخ کے ذمہ دار بھی

ہمارے نا اہل سیاستدان ہیں جو اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے ان کا سہارا تلاش کرتے ہیں اور یہ ادارے جب چاہے کسی بھی سیاستدان کی ان کمزوریوں کو سامنے لا کر اپنی مرضی کے لوگ عوام کے سامنے لے آتے ہیں۔ جیسا کہ فرزانہ کی پریس کانفرنس کے ذریعے بہت سیاستدانوں کے کالے کرتوت سامنے لائے گئے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ جب تک عوام میں شعور نہیں آجاتا۔

ان اداروں کی طرف سے عام آدمی پر دباؤ کی وجہ سے معاشرتی زندگی میں الجھنوں کو سامنے لانے کے بعد ناول نگار نے ناول کے اختتام پر خانزادہ اور فہیم کی صورت میں ایک امید کی کرن دکھائی ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے ڈٹ جائے اور ان کا مہرہ بننے کے بجائے آزادی کے لیے ڈٹ جائے تو تبدیلی کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

> "خالد فتح محمد ناول کے اختتام تک آتے آتے جو سماجی منظر نامہ ہمارے سامنے رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ سماج شدید جکڑ بندیوں کا شکار ہے جس میں لوگ اپنا اپنا دیا گیا کردار نبھانے پر مجبور ہیں، لیکن جو لوگ منجر بن زندگی نہیں گزارنا چاہتے انہیں اپنے اظہار کی آزادی چاہیے۔"(۳۵)

یوں خانزادہ کا ان کے دباؤ کے باوجود ٹی وی چینل کو جاری رکھنا اور ان کے راستوں سے انحراف کرانا اور اس کے ساتھ فہیم کی احتجاج کی کاوش مصنف کی طرف سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب عوام خود سے ہمت کر کے آگے بڑھے گی تو معاشرے کی یہ استحصال زدہ فضا اور گھٹن زدہ حالات بدلے جاسکتے ہیں۔ خالد فتح محمد اس سلسلے میں داد کے قابل ہیں کہ انہوں نے عوام کو بغاوت، ہنگامہ آرائی پر اکسانے کی بجائے ایک پر امن احتجاج کی ترغیب و حوصلہ دیا ہے کہ پر امن رہ کر بھی اپنا موقف حکومت تک پہنچایا جاسکتا ہے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ انداز ہے۔ موجودہ دور کے یہ نوحے، چیخیں،۔۔ جاسوس گھر کا ننگا پن اور اقلیتیوں کی چھترول اور خاندانی نظام میں بیگانگی کا تیز ہوتا عمل ایک مربوط شکل میں خالد فتح محمد کے ناول زینہ میں ایک تلخ حقیقت بن کر ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ناول "زینہ" میں مذہبی استحصال کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں ان میں، اقلیتی برادری کا استحصال، اور عوامی اداروں کی طرف سے عوام کا استحصال جیسی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ مذہبی استحصال میں عیسائی برادری سے لوگوں کی مذہب کے نام پر نفرت اور انھیں اپنے سے کم تر سمجھنا جیسے مسائل نظر آتے ہیں۔ مسلمان اور عیسائی برادری کی کشمکش اور ان کے لیے ادنیٰ نوکریاں ہمارے معاشرے کے وہ استحصالات ہیں جو ہمیں معاشرے میں کئی جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل اقلیتی برادری کے لوگ بھی ہمارے معاشرے

کا حصہ ہوتے ہیں اور بحیثیت انسان وہ بھی اپنے وطن سے محبت اور وفاداری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آئین بھی انھیں برابر کے حقوق دیتا ہے اس کے باوجود ہم لوگ انھیں دفتروں اور دوسرے اداروں میں قبولیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جس کی وجہ سے یہ لوگ استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی استحصال زدہ لوگ معاشرے میں وطن سے غداری سمیت دوسرے بہت سے مجرائم کا مرتکب ہوتے ہیں۔

ناول "زینہ میں مختلف انتظامی اداروں کی طرف سے لوگوں کا استحصال بھی اہم موضوع ہے جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو کردار ظفر بھٹی اور صحافی خانزادہ کے ذریعے ریاست کے خفیہ جاسوسی نظام یا جاسوس گھر کے معاشرے پر اثر ورسوخ کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ناول کے یہ دونوں ہی افراد جب تک ان خفیہ اداروں کی ایماکے مطابق چلتے رہے وہ سکوں میں رہے لیکن ان کی چھتری سے نکلنے کی کوشش کی تو دھمکیوں پر اتر آئے، جبکہ صحافی خانزادہ کو توغائب بھی کر دیا گیا۔ناول نگار نے ظفر بھٹی کی گفتگو کے ذریعے ان اقتدار کے بھوکے افراد کی مفاد پرستیوں سے پردہ اٹھایا ہے، اپنے مفاد کے لیے یہ قومی مفاد اور قیمتی انسانی جانوں کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

ناول "زینہ " میں جنسی استحصال کی بھی کئی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے المیے میں بھی جنسی استحصال کے ایسے ہے واقعات پیش آئے، جن کا ذکر تقسیم بنگال پر لکھی گئی تاریخ کی کتب کے ساتھ ساتھ اُردو ناولوں میں بھی ملتا ہے۔ناول "خلیج " میں بھی ان واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

ناول "زینہ " میں خالد فتح محمد نے انسانی استحصال کو پیش کیا ہے۔ ناول میں اقلیتی برادری کے مسائل بھی اُجاگر کیے گئے ہیں۔ ملکی سیاست پر بات کی گئی ہے اور پس پردہ رہ کر ملکی معاملات کو کنٹرول کرنے والوں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔مذہبی استحصال، میں مسلمان اور عیسائی برادری کے درمیان کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ اقلیتی برادری کے مسائل کو کوب اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ عیسائی برادری سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ انتظامی اداروں کی طرف سے بھی غریب لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ناول نگار نے ناول میں کئی جگہ انتظامی اداروں کی طرف سے کیے گئے استحصال کو پیش کیا ہے۔ افراد کی گم شدگی اور دہشت گردی جیسی انسانی استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱. عطاالرحمن میو، ڈاکٹر، محمد وقاص، میجر (ر) خالد فتح محمد کی ناول نگاری، مطبوعہ، نورِ تحقیق، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، جلد۳، شمارہ۱۱، ص ۲۴۰

۲. نگہت نورین، فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، "اجیت کور کے ناول" گوری" میں سماجی استحصال کا مطالعہ " مضمون مشمولہ زبان وادب، شمارہ ۲۴، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد ۲۰۱۹ء

۳. عماد ظفر، انسانی حقوق کا دن اور پاکستان میں انسانی حقوق کی گھمبیر صورتحال (مضمون)، www.nayadaur.tv ۱۱ فروری، ۲۰۱۹ء، ۷:۳۰PM

۴. محمد سلیمان حجام، "اُردو فکشن میں سماجی مسائل کی عکاسی"، مطبوعہ اُردو ریسرچ جرنل، شمارہ ۱۹، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء

۵. علی احمد فاطمی، "ترقی پسند تحریک سفر در سفر"، ادارہ نیا سفر، الہ آباد ۲۰۰۶ء، ص ۲۹

۶. زاہدہ حنا، ایک چشم کشا رپوٹ، ۱۸ جون، www.alarabiya.net، ۱۱ فروری، ۲۰۱۹ء، ۰۷:۱۵PM

۷. شہزاد منظر، "پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال"، پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، طبع اول ۱۹۹۷ء، ص ۵۵۹

۸. اختر حسین رائے پوری، "ادب اور انقلاب"، نیشنل ہاؤس بمبئی، سن ندارد، ص ۲۴-۲۵

۹. کرشن چندر، "نئے زاویے"، میری لائبریری لاہور، سن ندارد، ص ۱۵

۱۰. عطاء الرحمٰن میو، ڈاکٹر، محمد وقاص، "میجر (ر) خالد فتح محمد کی ناول نگاری"، ص ۲۴۰

۱۱. سیمیں کرن، "تین کتابیں۔ ایک جائزہ"، مطبوعہ سہ ماہی شعر و سخن، مانسہرہ، جلد ۱۹، شمارہ ۷۵، اپریل تا جون ۲۰۱۹ء، ص ۲۴

۱۲. آدم شیر، "خالد فتح محمد کا زینہ اور چند تاثرات"، مطبوعہ کراچی ریویو، شمارہ اپریل تا جون ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۳

۱۳. دانیال رضا "سوچ کا بلاوا کار ہم میں پاکستان"، ۵ نومبر ۲۰۲۰ء، www.chingaree.com

۱۴. محمد شہباز عزیز، " ایک اور اندلس، بھارت میں اقلیتوں کے حقوق کی پامالی اور عدم تحفظ"، www.mirrat.com ۱۰ فروری، ۲۰۱۹ء، ۱۰:۰۰AM

۱۵. سحر انصاری، پروفیسر، "اکیسویں صدی اور ادیب"، مطبوعہ مکالمہ، شمارہ نمبر، ۲ جنوری ۲۰۱۲ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۴۲۳

١٦. خالد فتح محمد، "زینہ"، لاہور، عکس پبلیکیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۳۷
١٧. ایضاً، ص ۲۰۳
١٨. ایضاً، ص ۲۰۸
١٩. ایضاً، ص ۳۶۲
۲۰. ایضاً، ص ۳۶۹
۲١. حفیظ تبسم، "خالد کا زینہ"، www.facebook.com ۲ جنوری ۲۰۲۱ء، ۸:۰۰AM
۲۲. حفیظ تبسم، "خالد کا زینہ"، www.facebook.com ۲ جنوری ۲۰۲۱ء، ۸:۰۰AM
۲۳. خالد فتح محمد، "زینہ"، ص ١٦٦
۲۴. ایضاً، ص ١٨۳
۲۵. ایضاً، ص ١٨۴
۲٦. ایضاً، ص ۳۴۸
۲٧. ایضاً، ص ۲۰۸
۲٨. آدم شیر، "خالد فتح محمد کا زینہ اور چند تاثرات"، مطبوعہ کراچی ریویو، شمارہ اپریل تا جون ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۰
۲۹. خالد فتح محمد "زینہ" لاہور، عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۵۔۲۱٦
۳۰. ایضاً، ص ۲۱٧
۳۱. ایضاً
۳۲. خالد فتح محمد، زینہ، لاہور عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۲۳۲
۳۳. ایضاً، ص ۳۱۲
۳۴. ایضاً
۳۵. ایضاً

باب چہارم:

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ:

لفظ استحصال کا مفہوم یہ ہے کہ حصہ داری کے کام میں کسی دوسرے کا حصہ ہتھیانا، فائدہ حاصل کرنا، ناجائز فائدہ اٹھانا وغیرہ ہیں۔ اس کے لیے جھپٹ، چھین، خود مطلبی، طلب اور حصول وغیرہ کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور سے آج تک انسانی استحصال کا بنیاد کسی بھی معاشرے میں پیدا ہونے والی معاشی ناہمواریاں رہیں۔ جب دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہوئی اور بورژوا کے پاس دولت اور پرولتاریہ کے حصے میں صرف مزدوری آئی تو معاشرے میں ایک طبقہ غریب سے غریب تر اور امیر سے امیر تر ہوتا چلا گیا۔ انسان نے اپنی لالچ کے زیر اثر آکر انسان کی پہچان کرنا چھوڑ دی وہ زندگی کے اس دور میں واپس چلا گیا جہاں سے معاشرتی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی۔ معاشی ناہمواریوں کی بدولت معاشرے میں ذہنی، جسمانی، سماجی اور معاشی استحصال کی صورتیں سامنے آئیں۔ ادب کی ابتدا سے ہی استحصال کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ ابتدائی دور میں انسانی سماجوں میں اجتماعیت اور اشتراکیت کا عنصر غالب رہا اور غالباً یہی انسانی زندگی کی بقا کا ضامن بھی تھا۔ سماج اپنے خاص ارتقائی سفر کے مختلف ادوار میں متعدد نظاموں سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا۔ ان نظاموں میں غلام داری، جاگیرداری اور سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کا دور رائج ہوا تو معاشرے اور فرد کے مابین تعلقات معاشی بنیادوں پر بدلنے شروع ہو گئے۔ اس طرح پیداوار اور اس کے ذرائع پر قبضے کی بنا پر فیصلہ سازی کا عمل شروع ہوا۔ جو انسانی استحصال کی بنیاد بنا۔ یہاں سے انسانوں کا استحصال انسانوں ہی کے ذریعے شروع ہوا۔

غریب اور مزدور طبقہ کا ہر جگہ استحصال ہوتا رہا ہے اور آج بھی اس کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے۔ اس بات سے خود بھی یہ طبقہ بخوبی آگاہ ہے۔ سب سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود بھی وہ ایسی ذلت زدہ زندگی کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ یہاں انسانی ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سماجی شعور رکھنے کے باوجود بھی یہ لوگ اپنے حقوق کے لیے صدا بلند نہیں کر پاتے۔ آخر کیوں؟ جانچ پرکھ کے بعد متعدد وجوہات سامنے آتی ہیں سب سے بڑی وجہ تو خود اس طبقے میں پھیلی نااتفاقی ہے۔ دوسری وجہ بھی اس تسلسل کی کڑی ہے کہ سرمایہ دار انھیں کسی سطح پر متحد ہونے نہیں دیتا۔ وہ اپنی چالبازیوں اور چالاکیوں کے جال کو اسی طرح بُنتا ہے کہ غریب بیچارہ اس

جال کے ذریعے غربت کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ وہ اسی طبقہ کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اس پر چند مراعات نچھاور کرتا ہے اور مراعات کے ساتھ ہی اس کی زندگی کو اپنے پاس گروی رکھ لیتا ہے۔

خالد فتح محمد اکیسویں صدی کے ممتاز اور نمائندہ ناول نگار ہیں۔ اب تک ۹ ناول، ۵ ترجمہ شدہ ناول (ترکی ادب سے) اور ٦ افسانوی مجموعوں کے ساتھ اپنے فن کی داد پا چکے ہیں۔ خالد فتح محمد نے قدرے تاخیر سے لکھنا شروع کیا لیکن جب لکھنا شروع کیا تو خوب لکھا اور ناول نگاری، افسانہ نگاری، ترجمہ، تنقید ہر میدان میں اپنا لوہا منوایا۔

ان کی تحریروں کا بنیادی موضوع معاشرتی ناانصافی، غربت، بھوک، سیاسی مسائل (جو سماجی مسائل کا سبب بنتے ہیں) ہیں۔ جن پر وہ جرات مندانہ انداز میں آواز بلند کرتے ہیں۔ ناول نگار نے نہ صرف معاشرتی برائیوں اور مسائل سے پردہ اٹھایا ہے بلکہ وہ ان مسائل کے حل کے لیے علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔

اس تحقیقی مقالے میں مصنف کے دو ناولوں "خلیج"، "زینہ" کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ "خلیج" میں ایک جنگ کے زدہ علاقے کے مناظر پیش کیے گئے ہیں اور یہ علاقہ مشرقی بنگال ہے۔ جنگی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے عوام پر گزرنے والی قیامت کرداروں اور واقعات کے ذریعے سامنے لاتے ہیں۔ اور اس ضمن میں مشرقی اور مغربی دونوں عوام کے استحصال کو دکھایا ہے۔ مشرقی مفاد پرست حکمرانوں کی چال بازیوں کو بے نقاب کیا ہے، جنہوں نے اپنی عوام کو دھوکے میں رکھ کر سارا ملبہ مغربی پاکستان کے سر ڈالا۔ مغربی فوجی کمانڈ کی طرف سے ہونے والے ظلم اور مغربی سپاہیوں کی طرف سے بنگالی عورتوں کے جنسی استحصال کے واقعات بھی پیش کیے ہیں۔ گھر سے دور بیٹھے مغربی فوجی اور ان کی مایوسیوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں کہ وہ کس طرح بے بس ہیں لیکن حکم کے بھی پابند ہیں۔ ان کی بے بسی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ انہی لوگوں سے برسرپیکار ہیں جن کی حفاظت کا انھوں نے عہد کیا تھا۔ عورت جو ہر معاشرے میں ہی ظلم واستحصال کا شکار رہتی ہے جنگ کے دنوں میں بھی سب سے پہلے دشمنوں اور اپنے لوگوں کے ہاتھوں کے زیادتی کا شکار ہوتی ہے۔ ناول "خلیج" میں یاسمین کا کردار ان استحصال کا شکار عورتوں کی نمائندہ ہے۔ مکتی باہنی کے گھناؤنے کردار کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔

عورت ہر خطے اور ہر قوم میں مظلوم تھی چاہے وہ یونان وروم ہو یا مصر و عراق۔ چین ہو یا عرب ہر جگہ اس پر ظلم ہو رہا تھا۔ بازاروں اور میلوں میں اس کی سر عام خرید و فروخت کی جاتی تھی اور حیوانوں سے بدتر اس کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ عرب میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا اور ہندوستان میں ستی کرنا یہ ایسے اعمال تھے

جو عورتوں کے حقوق اور مراعات کے منکر تھے۔اس طرح دنیا کی بیشتر تہذیبوں میں عورت کی کوئی سماجی حیثیت نہیں تھی،اس کے سیاسی اور معاشی حقوق نہیں تھے۔ کہیں کہیں پر بالا دستی قائم بھی ہوئی مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑااور مسلسل اس کے حقوق پر دست درازیاں جاری رہیں۔ مگر جمہوری عہد میں عورت کی حیثیت یکسر بدل گئی۔اس کو وہ تمام حقوق و مراعات حاصل ہو گئیں جو اس سے قبل اس کے لیے خواب سے تھے۔

آج ہم بہ حیثیت قوم جن مسائل سے دوچار ہیں،خالد فتح محمد ان مسائل اور ان کے پسِ پردہ عوامل کو کمال خوبی سے قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔وہ نہ صرف اس زبوں حالی اور اس کے ذمہ داران کے بارے میں آگاہ ہوتے بلکہ ان مسائل سے چھٹکارہ پانے کی خواہش بھی اس کے اندر سلگنے لگتی ہے۔یہی وہ تحریک ہے جو قارئین کو سعی وجہد کی راہ سجھاتی ہے۔

ناول "زینہ" میں خالد فتح محمد نے انسانی استحصال کو پیش کیاہے۔ناول میں اقلیتی برادری کے مسائل بھی اُجاگر کیے گئے ہیں۔ ملکی سیاست پر بات کی گئی ہے اور پس پردہ رہ کر ملکی معاملات کو کنٹرول کرنے والوں کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔مذہبی استحصال، میں مسلمان اور عیسائی برادری کے درمیان کشمکش کو پیش کیا گیاہے۔ اقلیتی برادری کے مسائل کو خوب اچھی طرح اجاگر کیاہے۔ عیسائی برادری سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔انتظامی اداروں کی طرف سے بھی غریب لوگوں کا استحصال کیا جاتاہے۔ناول نگار نے ناول میں کئی جگہ انتظامی اداروں کی طرف سے کیے گئے استحصال کو پیش کیاہے۔ افراد کی گم شدگی اور دہشت گردی جیسی انسانی استحصال کو پیش کیا گیاہے۔

خالد فتح محمد کچھ عرصہ خود بھی مشرقی پاکستان میں رہے،اس لیے وہاں کے حالات اور حقائق سے بخوبی واقف تھے،یوں انہوں نے اپنے ناول "خلیج" میں مشرقی پاکستان کے المیے کا سیاسی، سماجی اور فوجی تجزیہ کیا ہے۔ناول میں مصنف نے کچھ کرداروں اور واقعات کے ذریعے مختلف موضوعات پیش کیے ہیں۔ اس ناول میں انسانی استحصال کی جو صورتیں سامنے آتی ہیں ان میں سماجی استحصال، جنسی استحصال، اور سیاسی استحصال پیش کیاہے۔ سیاسی استحصال میں سیاسی کشمکش کو عمدہ طریقے سے پیش کیاہے۔ مشرقی پاکستان کے حالات ، ہجرت کے دوران انسانوں کا استحصال وغیرہ اہم موضوعات ہیں۔خالد فتح محمد کی تحریروں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کے سامنے سچائی کا اظہار کیا جائے تاکہ ماضی سے سبق سیکھ کر وہ اپنے حال اور مستقبل کو ابن

الوقت قسم کے رہنماؤں کی دل فریب چالوں سے محفوظ رکھ سکیں۔اس کے ساتھ ساتھ اپنی عقل و دانش اور محنت سے اپنی زندگیوں کو باوقار بنائیں۔

دنیا میں اگر کہیں معاشی ظلم اور ناانصافی نظر آتی ہے تو وہ وسائل معاش میں کمی کے باعث نہیں بلکہ ان وسائل کی غلط اور غیر منصفانہ تقسیم کی وہ سے ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے راہ ہدایت کا سرچشمہ حضرت محمد ﷺ کو بنایا اور قانون کے لئے اپنی آخری کتاب قرآن کریم نازل فرمائی۔اسلام دین فطرت ہے اور اس میں انسان کو ہر مضر شے سے منع کیا گیا ہے۔معیشت جو کہ انسانی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے اس کے بارے میں دین اسلام کے اندر مکمل راہنمائی موجود ہے تاکہ عوام الناس کے اندر وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کو روکا جاسکے۔

دوسرا ناول "زینہ "جو مقالے میں زیرِ بحث رہا ہے،اس میں بھی خالد فتح محمد نے معاشرتی برائیوں، سیاستدانوں کی ریشہ دوانیوں اور ریاست کے خفیہ اداروں کے عام آدمیوں تک اثر ورسوخ کو کھول کر بیان کیا ہے،اقلیتوں کے استحصال پر بھی قلم کشائی کی ہے۔مذہبی اجارہ داروں کی من مانیاں بھی دکھائی ہیں جو اپنی شرافت قائم کیے ہوئے ہیں۔یہ مذہبی اجارہ دار خدا کو لوگوں پر ایک لٹھ کے طور استعمال کرکے انھیں خوف میں مبتلا رکھتے ہیں تاکہ کوئی ان سے جواب طلبی نہ کر سکے۔معاشرے میں اقلیتی برادری اور بالخصوص ان کی عورت کو درپیش مسائل،ناول "زینہ "ان سب کا بیان ہے۔

یوں خالد فتح محمد کا "زینہ " بھی بہت سی معاشرتی برائیوں سے پردہ اٹھاتا ہے اور ناول ے اختتام پر مرکزی کردار کا اقلیتوں کے حقوق کے لیے پر امن احتجاج قاری کو ایک تحریک دیتا ہے کہ اپنے حق کے لیے ڈٹ جائیں تو کامیابی مِل سکتی ہے۔

ایک بات جو خالد فتح محمد کو ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے کہ وہ قاری کو تحریک تو دیتے ہیں اور ان کو اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کے لیے احتجاج کی راہ بھی دکھاتے ہیں لیکن کبھی بھی اپنی تحریر میں نعرہ بازی اور انتشار کی فضا پیدا نہیں کرتے بلکہ اپنے کرداروں کے مکالموں اور واقعات کے ذریعے ایسی صورتحال پیدا کرتے ہیں کہ پہلے سے سوچے گئے نتائج سامنے آنے لگتے ہیں۔

ب۔نتائج:

خالد فتح محمد کے دوناولوں "خلیج"،"زینہ "میں دکھائے گئے انسانی استحصال کا تجزیہ کرتے ہوئے درج ذیل نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

ا۔ خالد فتح محمد کے ناولوں میں استحصال کی کئی صورتیں ہیں جو معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔جن میں سماجی ،سیاسی ،مذہبی، نفسیاتی ،جنسی استحصال شامل ہیں۔تحقیق سے اخذ کیا گیا ہے کہ مصنف کے دونوں ناولوں "خلیج"اور "زینہ "میں کرداروں اور واقعات کے ذریعے استحصال کی ان تمام صورتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

۲۔ ان دونوں ناولوں میں معاشرے کے مظلوم طبقے،اقلیتوں،عورتوں کے استحصال،بر سرِ اقتدار طبقے کی مفاد پرستوں اور اس کے نتیجے میں ہونے والے عوام کے استحصال کی داستان کو جرات مندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ جب کوئی معاشرہ اپنی قلیتوں اور کمزورافراد کے دفاع کے لیے کھڑا نہ ہو سکے اور استحصالی قوتیں جبر واستحصال کرتی رہیں تو یہی استحصال معاشرے کی ساخت کو کھوکھلا کرنے لگتا ہے اور معاشرہ تنزلی کا شکار ہو جاتا ہے۔

ج۔ سفارشات

خالد فتح محمد کے دوناولوں "خلیج"،"زینہ "میں دکھائے گئے انسانی استحصال کا تجزیہ کرتے ہوئے درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

ا۔ خالد فتح محمد نے افسانوں میں معاشرتی مسائل کی عکاسی کی ہے،ان کے افسانوں میں معاشرتی استحصال کی عکاسی پر تحقیق کی جاسکتی ہے۔

۲۔ مصنف نے ترکی ادب کے ناول اردو میں ترجمہ کیے ہیں،ان کے ترجمہ شدہ ناولوں کو تحقیق کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

۳۔ اکیسویں صدی کے اردو ناول میں معاشرتی استحصال پر تحقیق کی سفارش کی جاتی ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ:

خالد فتح محمد، "خلیج"، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

خالد فتح محمد، "زینہ"، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

ثانوی مآخذ:

احتشام حسین، تنقید اور عملی تنقید، ادارہ فروغ اردو لکھنؤ، ۱۹۶۴ء

اختر حسین رائے پوری، "ادب اور انقلاب"، نیشنل ہاؤس بمبئی، سن ندارد

ارشد محمود، "سماجی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ"، سٹی پریس بک شاپ، عبد اللہ ہارون روڈ، کراچی، ۲۰۱۲ء

انور سدید، ڈاکٹر، اختلافات، مکتبہ اردو زبان، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷

شبنم رضوی، "عصمت چغتائی کی ناول نگاری"، نیو پبلک پریس، دہلی ستمبر ۱۹۹۲ء

شہزاد منظر، "پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال"، پاکستان سٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، طبع اول ۱۹۹۷ء

شوکت صدیقی، "جانگلوس (جلد اول)"، کتاب پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء

صغرا مہدی، "اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت"، سجاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۰۲ء

صفدر محمود، ڈاکٹر، "پاکستان کیوں ٹوٹا"، جنگ پبلشرز لاہور، ۱۹۹۳ء

عزیز احمد، "ترقی پسند ادب"، چمن بک ڈپو اردو بازار، دہلی، سن ندارد

علی احمد فاطمی، "ترقی پسند تحریک سفر در سفر"، ادارہ نیا سفر، الہ آباد ۲۰۰۶ء

علی سردار جعفری، "ترقی پسند ادب"، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۱ء

قمر رئیس ڈاکٹر، "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثت ناول نگار"، دوسرا ایڈیشن سر سعید بک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۲۳ء

کرشن چندر، "ایک عورت ہزار دیوانے"، ایشیا پبلیشرز، دہلی، ۹۸-۱۹۹۷ء

کرشن چندر، "نئے زاویے"، میری لائبریری لاہور، سن ندارد

ہنس راج رہبر، "ترقی پسند ادب ایک جائزہ"، آزاد کتاب گھر کلاں محل، دہلی، ۱۹۶۷ء

الیاس احمد گدی، "فائر ایریا"، معیار پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۹ء

لغات:

آکسفورڈ ایڈوانس لرنر لغت، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۴ء

آزاد دائرۃ المعارف

فیروزالدین مولوی،(مرتب) فیروزالغات، فیروز سن لاہور، ۲۰۱۰ء

وارث سرہندی، ایم اے علمی اُردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۲۳ء

رسائل وجرائد:

"اُردو ریسرچ جرنل"، شمارہ ۱۰، نئی دہلی، فروری تا اپریل ۲۰۱۴ء

"اردو ریسرچ جرنل،، شمارہ ۶، نیو دہلی، جولائی ۲۰۱۵ء

"اُردو ریسرچ جرنل"، شمارہ ۱۱، نئی دہلی، جولائی تا ستمبر ۲۰۔۲۰۱۷

اُردو یسرچ جرنل، شمارہ ۱۹، نئی دہلی، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۹ء

"زبان وادب"، شمارہ ۲۴، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد ۲۰۱۹ء

"سہ ماہی شعر و سخن"، مانسہرہ، جلد ۱۹، شمارہ ۷۵، اپریل تا جون ۲۰۱۹ء

"کراچی ریویو، کراچی، شمارہ اپریل تا جون ۲۰۱۹ء

"ماہنامہ فنون" شمارہ نمبر ۱۲، لاہور، دسمبر ۱۹۷۱ء

"مکالمہ"، شمارہ نمبر، ۲ جنوری ۲۰۱۲ء تا دسمبر ۲۰۱۳ء

"نورِ تحقیق"، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، جلد ۳، شمارہ ۱۱

اخبارات:

"روزنامہ ایکسپریس" لاہور، ۱۱ فروری، ۲۰۱۹ء

"روزنامہ نوائے وقت" لاہور، ۵ فروری، ۲۰۱۶ء

"روزنامہ نیازمانہ"، لاہور، ۲۵ اپریل ۲۰۱۶ء

"روزنامہ نئی بات" لاہور، ۲۵ نومبر ۲۰۱۹ء

ویب گاہیں (انٹرنیٹ):

https//ur.m.wikipedia.org

https//plato.standford Encyclopaedia of philosophy

https//www.lexico.com

https//www.yowrdictinary.com

https//www.humsub.com.pk

https//www.nawaiwaqt.com.pk

https//www.nayadaur.tv

https//www.urdu.geotv

https//www.chigaree.com

https//www.mirrat.com

www.gaatw.org/resources

https//www.hilal-gov-pk/urdu-article

https//www.express.pk

https//www.wikipedia.org

https//www.dw.urdu

https//www.alarabiya.net

ضمیمہ اول

مقالہ نگار کا خالد فتح محمد سے انٹرویو

مقالہ نگار: ادیب کی حکومتی و عوامی سطح پہ پذیرائی اس کی تخلیق پہ کس طرح کے اثرات ڈالتی ہے؟

ناول نگار: میں نے جب بھی کوئی کتاب شائع کرائی تو اس کے بعد میں نئی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں اس چیز کا قائل ہوں کہ ادیب کو ادب تخلیق کرنا چاہیے، لوگ اس کے لکھے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں یہ جاننے کے لیے ہلکان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آپ کے لکھے میں دم ہو گا، تو لوگ پڑھنے کے بعد خود چاہیں گے کہ اس پر بات کریں۔ پروپیگنڈے اور شور شرابے سے حاصل کی جانے والی شہرت کے پاؤں نہیں ہوتے، بس ہوا ہی ہوا ہوتی ہے، جو کہ زمین پہ کم ہی ٹکنے دیتی ہے۔

مقالہ نگار: ایک ادیب کی شخصیت اس کی تخلیق میں کس حد تک شامل ہوتی ہے؟

ناول نگار: مجھے تخلیق کار کی مظلومیت سے ہمیشہ ہمدردی رہی ہے کہ وہ بے چارہ اچھے اور برے دونوں کرداروں کو خود سہتا ہے۔ درحقیقت ایک تخلیق کار کے اندر کئی کردار اور ان کرداروں کے مختلف بہروپ سانس لے رہے ہوتے ہیں، یعنی بیک وقت وہ کئی زندگیاں جی رہا ہوتا ہے۔ ہر خصلت کے کردار کی کامیاب پیش کش ہی کسی تخلیق کار کی بڑائی ثابت کرتی ہے۔

مقالہ نگار: آپ کے ناول "زینہ" اور "خلیج" میں انسانی استحصال کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ کیا آپ حقیقی دنیا میں بھی اس قسم کے استحصالی واقعات دیکھتے ہیں؟

ناول نگار: کوئی بھی ادیب معاشرے سے الگ نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ معاشرے میں دیکھتا ہے اپنی تخلیقات میں بیان کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے مذکورہ ناولوں میں انسانی استحصال کی جو حالتیں بیان کی ہیں وہ ہمارے معاشرے میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ معاشرے کی ترقی میں رکاوٹ بھی ڈالتی ہیں۔

مقالہ نگار: اردو ناول میں لکھے گئے چند اہم ناول جو آپ کی نظر میں اردو ناول کا وقار ہوں؟

ناول نگار: اگر پچھلی صدی کی بات کی جائے تو "آگ کا دریا" وہ پہلا ناول تھا جس نے کافی عرصے تک قارئین کو اپنی طرف متوجہ رکھا۔ کرشن چند کا "شکست" بھی ایک اہم ناول تھا۔ پھر "اداس نسلیں" کی باری آتی ہے مگر مجھے عبداللہ حسین کا بعد میں چھپنے والا ناول "باگھ" زیادہ پسند ہے۔

مقالہ نگار: کوئی ایسی شخصیت یا خاص واقعہ جس نے آپ کو لکھنے کی تحریک دی؟

ناول نگار: اگرچہ میں کافی عرصے سے پڑھ رہا تھا لیکن میں نے جب ہیمنگوے کا ناول "فیئر ویل ٹو آرمز" پڑھا تو میرے اندر خواہش جاگی کہ میں لکھوں اور وہ اس طرح کا ناول۔ آج بھی جب میں اس سرشاری کے متعلق جو اس ناول کو پڑھ کے حاصل ہوئی اس کو سوچتا ہوں تو مجھے بے پناہ مسرت ہوتی ہے۔

مقالہ نگار: ایک طرف آپ ترقی پسند تحریک کے پیروکار ہیں، دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا سے بھی آپ کی صحبت رہی، یہ تضاد کیسا؟

ناول نگار: نہیں اس میں تو کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایسی کئی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں دو اشخاص اپنے نظریاتی اختلاف کے باوُجُود ذاتی تعلقات میں خوش گوار رہے۔ ابو الکلام آزاد اور مولانا شیرانی، جوش ملیح آبادی، اور مولانا مودودی، ممتاز مفتی اور احمد بشیر کے تعلقات اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ آغا صاحب سے مضبوط تعلق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری نظریاتی بحث کبھی نہیں ہوئی۔ میں انہیں بزرگ سمجھتے ہوئے کچھ سوال لے کے، کچھ سیکھنے کی غرض سے جاتا تھا۔ ان کا شاعری اور ادب کی دیگر اصناف کا مطالعَہ بڑا وسیع تھا، مگر وہ مجھ سے فکشن کی پڑھت کے متعلق پوچھتے۔ میں نے جو بھی ناول پڑھا ہوتا، اس کی کہانی بتاتا وہ ایک ماہر ایڈیٹر کی طرح اس پہ گفتگو کرتے۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں کہ ایک دفعہ انہوں نے مجھے کہا کہ ہر رائٹر کو ایک horror یا mystery سٹوری لکھنی چاہیے۔ میں نے اس سے تحریک پا کر ٹبا لکھا جسے انہوں نے بے حد پسند کیا۔ پھر ایک اور بات کہ ترقی پسند ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ غیر ترقی پسندوں سے قطعِ تعلق کر لیا جائے۔ اگر منیر نیازی، مجید امجد، یا میراجی، ترقی پسند تحریک تحریک سے وابستہ نہیں تھے تو کیا ہم ان کی شاعری کو یک سَر رد کر دیں؟ آغا صاحب کا بھی یہی معاملہ ہے کہ وہ بہت پڑھے لکھے، اور کثیر الجہت شخص تھے۔ انہوں نے اگر فیض صاحب کی شاعری کو جمود کی علامت قرار دیا، تو میں کیوں برا مانوں؟

مقالہ نگار: ادب اپنے عہد سے کس قدر اثر لیتا ہے؟

ناول نگار: اب تک سب سے بڑا ناول جسے مانا جاتا ہے وہ War and Peace ہے۔ اسی طرح برِّ صغیر کی تقسیم ایک سانحہ تھا؛ تقسیم کے وقت بھی اس پہ لکھا گیا جب کہ تقسیم کے بعد اب تک لکھا جا رہا ہے۔ اس وقت جنھوں نے بھی لکھا سوائے بیدی کے افسانے لاجونتی کے، ہر کسی نے جانب داری برتی، کسی نے مسلمان کو برا بھلا کہا کسی نے سکھوں کو ملامت کی؛ کسی نے ہندوؤں کو ملامت کی۔ تو جو اس سانحے کا غیر جذباتی اور غیر جانب دارانہ تجزیہ ہے، وہ وہی ادیب کر سکتا ہے، جو ایک خاص فاصلے پہ کھڑا ہو۔ مراد یہ کہ ادب کسی خاص عہد کی ثقافتی، سیاسی، سماجی تاریخ ہی بیان کرتا ہے، مگر رسمی تاریخ سے جو چیز اسے مختلف کرتی ہے وہ غیر جانب دارانہ تجزیہ ہی ہے۔

مقالہ نگار: آپ کے نزدیک فکشن اور حقیقت میں کیا فرق ہے؟

ناول نگار: فکشن اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے جو چیز آپ دیکھتے ہیں وہ آپ من و عن نہیں لکھتے بلکہ اسے ایک تخیل دیتے ہیں اور اسی حقیقت کو ڈھالتے ہیں۔ اگر چہ میں سابقہ مشرقی پاکستان میں رہا اور وہاں جو کچھ دیکھا اسے اپنے تخیل سے کہانی بنا کر ناول میں پیش کر دیا۔ اسی طرح اگر اقلیتوں کے بارے میں سلوک کو جیسا دیکھا گیا ہے پیش کر دیا جائے تو وہ ادب نہیں ہوگا بلکہ صحافتی کالم یا خبر بن جائی گی۔ اس لیے ایک ادیب انہی حقیقتوں کو اپنے اسلوب اور تخیل کے ذریعے ادب کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔